طارق
اکیڈمی

# کالا پانی

ترتیب تہذیب : محمد سرور طارق

www.KitaboSunnat.com

طارق اکیڈمی فیصل آباد

ناشر: شہید اکیڈمی جامعہ تعلیم الاسلام - ماموں کانجن
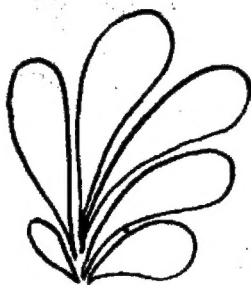
ناشر ـــــ طارق اکیڈمی فیصل آباد

طباعت ـــــ اسود آفسٹ پریس فیصل آباد

کتابت ـــــ احسان الحق

تزئین ـــــ ابنِ نسیم

تاریخ اشاعت ـــــ نومبر ۱۹۷۷ء

قیمت: ـــــ مجلد ۹ روپے
پیپربیک ۸ روپے

تقسیم کنندگان: ـــــ


الاخوان
چنیوٹ بازار فیصل آ

# فہرست

# تقریبِ اشاعت

زیرِ نظر کتاب "کالاپانی" تحریک احیائے دین امیر المومنین حضرت سید احمد شہید رح اور حضرت امام محمد اسمٰعیل شہید رح کی ایک درخشندہ ترین جھلک ہے۔ اس کی اشاعت سے مقصد صرف یہ ہے کہ شاید اس کے مطالعہ سے مملکت خداداد پاکستان میں محمدی انقلاب برپا کرنے کے مقدس ترین فرض سے عہدہ برآ ہونے کی سعادت کسی بھائی کو نصیب ہو جائے ؎

تاریک شب ہے جُدا اپنے قافلے سے ہے تو
تیرے لیے ہے میرا شعلہ نوا قندیل

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے ہماری لغزشوں کو معاف فرماتے ہوئے ہمیں بھی اس مقدس ترین نصب العین میں کامیابی و کامرانی سے سرفراز فرمائے ؎

ما سبک روحاں بامید شہادت زندہ ایم
در خیالِ ما حیاتِ جاوداں گراں باشد

حضرت سید عمر فاروق غزنوی زید مجدہ نے بھی جو اپنے مرحوم بھائی حضرت سید ابو بکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اپنے دل میں احیائے دین کی تڑپ رکھتے ہیں ——— کئی مرتبہ فرمایا کہ میری تمنا ہے "کالاپانی" کو شہید اکیڈمی کی طرف سے شائع کیا جائے، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور ہمارے لیے ذریعہ نجات بنا دے۔

محمد سلیمان عفی عنہ بن امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی رح
نامزد جانشین حضرت امیر المجاہدین عارف باللہ
صوفی محمد عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ
جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن

# مقدمہ[1]

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی انبیآئہ سیما الخاتم لھم والسلام علی الاتقیاء البررۃ المکرمین الی یوم الدین -

پیشِ نظر کتاب مولانا محمد جعفر تھانیسری مغفور کی خود نوشت سرگزشت ہے —— اس کتاب میں متعدد مقامات پر وہابی یا اہلحدیث کا تذکرہ ملے گا "وہابی" کا لفظ تو سرکارِ انگریزی کا خود ساختہ ہے ۔ اہلِ توحید نے ان شخصی نسبتوں کو اپنے لیے کبھی پسند نہیں کیا البتہ اہلِ حدیث" کے لفظ کو اپنے مسلک کے لحاظ سے ضرور پسند کیا گیا۔ اس وقت میں نہیں کہہ سکتا کہ جماعت کی اس لفظ کے متعلق کیا پوزیشن ہے لیکن اصل وضع کے وقت یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ اس لقب کے ساتھ نظر و فکر کے ان سکوداں ... احتساب مقصود تھا، جو جمودِ تقلیدی کے ترجمان تھے اور اس فرقہ پروری کے سبب اسلام پر کئی حد بندیاں لگا دی گئی تھیں، جن کو عبور کرنا ترکِ اسلام کے مرادف یا کم ازکم فسق و معصیت سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ اسلام نے سب سے بڑی نعمت جو اپنے متبعین کو عطا فرمائی تھی، وہ یہی حرّیتِ فکر تھی اور آباء و اجداد کی رسوم اور پابندیوں سے نجات -

پہلی صدی کے اواخر اور دوسری صدی کے اوائل میں گو بہت سے مفاسد اور خرابیاں پیدا

---

[1] ۱۹۴۱ء (۱۳۶۰ھ) کی بات ہے جب خاکسار فیروز پور (مشرقی پنجاب) کی جامع اہلحدیث گنبد ان والی میں مقیم تھا کہ مولانا محمد جعفر تھانیسری کی مشہور کتاب تواریخ عجیبہ (کالا پانی) کو عمدہ طریق سے شائع کرنے کا ارادہ ہوا تھا، جس پر مقدمہ لکھوانے کی درخواست حضرت مولانا محمد اسمٰعیل گوجرانوالہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں کی گئی۔ مرحوم و مغفور نے حسبِ عادت قلم برداشتہ نہایت فاضلانہ مقدمہ سر کر کے بذریعہ ڈاک فیروز پور ارسال فرما دیا تھا لیکن افسوس! بوجوہ کتابِ مذکور کی اشاعت کی نوبت نہ آئی

ہو چکی تھیں۔ تاہم عقل و دانش اور فہم و فراست کے کھلے اور وسیع دروازوں پر یہ قفل نہیں پڑے تھے، جو چوتھی صدی ہجری کی پیداوار ہیں۔ پہلی صدی ہجری میں محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء کا وہ ریلا جس نے سب سے پہلے کراچی کے راستہ ساحلِ (متحدہ) ہند کو عبور کیا، ایسے مقدسین پر مشتمل تھا جو اسلام کے آبِ زلال کو اس کے اصل سرچشموں سے حاصل کرنے کے عادی تھے۔

اس کے بعد علم کی کمی اور زمانۂ نبوت کے بُعد نے فرقہ پرستی کا یہ تسمہ پیدا کر دیا، جس میں آج کل ہم مبتلا ہیں اور بے حسی کا یہ عالم ہے کہ خود اس جمود و تقلید پر فخر کرتے ہیں، علمائے امت اور ائمۂ اصلاح و تجدید کے متعلق یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح قاصر النظر

---

۱۹۴۷ء میں پاکستان آنے پر جو مختصر سے چند کاغذات راقم کے ساتھ آئے (ہزاروں کی قیمتی اور نادر ذاتی کتب اور بعض ضروری کاغذات تو وہیں فسادات کی نذر ہو گئے) ان میں خوش قسمتی سے حضرتؒ کا یہ "مقدمہ کالاپانی" بھی تھا۔

گزشتہ دنوں اتفاقاً معلوم ہوا کہ ——— طارق اکیڈمی ——— کے زیر اہتمام کتاب " کالاپانی" کا تازہ ایڈیشن نہایت احسن انداز میں زیورِ طباعت سے آراستہ کیا جا رہا ہے لہٰذا اب یہ مبارک مقدمہ اس کے ساتھ شامل ہے۔ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شیئی قدرًا۔

واضح رہے کہ یہ نگارش ۳۵ سال پہلے کی ہے جبکہ اگرچہ انگریزی راج کے آخری سال تھے، تاہم برطانوی استبداد موجود تھا جس کی طرف مقدمہ میں قدرے اشارات ہیں نیز ان ہی دنوں ایک دیوبندی سیاست دان مولانا نے "علمائے ہند کا شاندار ماضی" نامی کتاب تالیف فرمائی تھی جس میں نہ صرف یہ کہ "علماء" کہلانے کا حق اپنے حلقے کے فقہائے احناف کو دیا گیا بلکہ "شانداری" کا کریڈٹ بھی۔ چونکہ اس کتاب کی تالیف کے زمانے میں بھی جماعت اہلِ حدیث تحریک آزادی وطن کے سلسلہ میں حضرت مقدمہ نویس اور مولانا ابوالقاسم بنارسیؒ کی قیادت میں علمائے دیوبند کے دوش بدوش سرگرم عمل تھی، اس لیے مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم و مغفور کو دیوبندی مولانا کی خلافِ واقعہ تاریخ نویسی سے دکھ پہنچنا قدرتی تھا، جس کا

تھے اور کتاب و سنت سے استدلال کی جرأت نہیں فرماتے تھے، پھر اس کے لیے ایسے حیل اور تاویلات پیدا فرماتے ہیں کہ جس سے ان حضرات کو بھی حیل کے فن کا مجتہد اعظم کہنے کو جی چاہتا ہے[1]۔ عیب اور اس کا عدم احساس بلکہ عیب پہ فخر ایسے امراض ہیں، جن پر امت کو ناز نہیں ہو سکتا بلکہ ندامت سے سر جھک جاتا ہے اور اصلاح حال کا ولولہ، یاس اور نا امیدی کا پیکر بن کر رہ جاتا ہے۔

## مصلحین کی مساعی

ہر صدی میں ایسے لوگ موجود رہے جو وقتی خرابیوں کو دیکھتے اور ان کے بے قرار دل، ان کی اصلاح کے لیے بے تاب ہو جاتے حدیث "لا یزال طائفۃ من امتی" کا مقتضیٰ بھی یہی تھا۔ ان تمام بزرگوں کا تذکرہ تفصیلی اس مختصر سی تحریر کا موضوع نہیں لیکن تاریخ کا ادنیٰ طالب علم آسانی سے یہ جان سکتا ہے کہ مصلحین، حسب حال ان تباہیوں کی روک تھام کرتے رہے اور اس راہ میں ہجرت، قید بلکہ دار و رسن تک کی صعوبتیں برداشت فرماتے رہے۔ حضرت امام مالکؒ، حضرت امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام سفیان ثوریؒ وغیرہ ائمہ اسلام ایک ایک اس

---

خفیف سا ذکر مقدمہ میں ہے جس میں ان کو حق بجانب سمجھنا چاہیئے۔

افسوس! مقدمہ میں مذکور تقریباً سبھی حضرات جناب مقدمہ نویس کی طرح آج ہم میں ح[illegible]

نہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

خاکسار محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی

ناظم المکتبۃ السلفیۃ، لاہور

غرہ محرم ۱۳۹۶ھ

[1] ملاحظہ ہو "الفرقان" بریلی کا شاہ ولی اللہ نمبر مولوی خیر محمد جالندھری کا مضمون "شاہ ولی اللہ حنفی"۔ (واضح رہے کہ مولانا مرحوم کی یہ تحریر اس زمانہ کی ہے جن دنوں یہ مجلہ نمبر شائع ہوا تھا۔ ع، ح)

کی نظیر میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

**سنّتِ الٰہی** گیارہویں صدی ہجری کے اواخر میں حق و باطل کی آویزش نے ایک ایسے معرکہ کی صورت اختیار کر لی تھی کہ کفر و فسق کے شیوع اور تعلیماتِ اسلامی کے انحطاط نے دنیائے ہست و بود کو ظلمت کدہ بنا دیا تھا، فجور اور بدعت کے بادل اس قدر محیط تھے کہ حق و صداقت کی کسی ہلکی سی کرن کے ظہور کی بھی امید نہیں کی جا سکتی تھی لیکن سنّتِ الٰہی کے مطابق مختلف مقامات میں مصلحینِ امّت کا ظہور رہا۔ عرب میں یہ شرف خطہ نجد کو ملا اور حضرت شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ تعالیٰ کا انتخاب عمل میں آیا۔ گو یہ تحریک سیاسی نہ تھی، اصلاحی تھی لیکن بتدریج سیاسی ہو گئی کیونکہ اسلام کا نظام ہی ایسا تھا کہ وہاں سیاسیات سے الگ رہ کر کسی کامیاب اصلاح کی توقع ہی نہ تھی۔ یہ تحریک "وہابی تحریک" کے نام سے عرب میں کافی کامیاب ہے۔ اہلِ نجد اسی نام سے پکارے جاتے ہیں اور اسے شاید اپنے لیے پسند بھی کرتے ہیں۔ اس وقت اس تحریک کو عرب میں علمی اور سیاسی اقتدار حاصل ہے فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

**دوسری تحریک** دوسری تحریک الجزائر اور ٹیونس میں شروع ہوئی جو "سنوسی تحریک" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ تحریک فرانس کے مظالم اور استبداد کی بدولت شروع ہوئی۔ سنوسی خاندان نے اس کی رہنمائی کی۔ گو یہ تحریک کھلے طور پر کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس کے بیج اس قدر گہرے ہوتے گئے کہ بالآخر فرانس کو لے ڈوبے۔ ملک کی اسی اندرونی ناراضگی نے ہٹلر کے مقابل فرانس کو چت گرایا اور ملک سے اسے کوئی امداد نہ مل سکی، اس کی تفصیلات ہمیں نہیں مل سکیں اور نہ ہی اس وقت وہ مطلوب ہیں۔

**تیسری تحریک** تیسری تحریک کے بانی حضرت شیخ جمال الدین افغانی ہیں۔ اس کی ابتداء ایران سے ہوئی، ہندوستان بھی اس سے متاثر ہوا بلکہ مصر، قسطنطنیہ اور یورپ تک اس کے اثرات پھیلے۔ آج بھی مصر میں زندگی کے آثار اسی کے سبب پائے جاتے ہیں۔ شیخ محمد عبدہؒ، سید رشید رضاؒ اور شیخ مراغی اسی تحریک کے

منہاقین سے ہیں جنہوں نے اپنی عمر یورپ کے سیاسی اقتدار کے خلاف اور عامۃ المسلمین کی اصلاح میں صرف فرما دیں۔ غرض مصر کی ساری بیداری شیخ جمال الدینؒ اور ان کے تلامذہ کی مساعی سے ہے۔ شکر اللہ مساعیھم

## چوتھی تحریکِ اصلاح

مغل حکومت سے پہلے بھی کوئی خالص اسلامی حکومت نہ تھی، اس کے نظام میں غیر اسلامی اثرات بہت زیادہ تھے۔ اپنے عروج کے زمانہ میں بھی یہ حکومت مہدویت[1] اور شیعیت کے اثرات سے مرکب تھی، باستثناء ایک دو کے عموماً بادشاہ جاہل تھے، ان کی ہوا پرستیوں کے ساتھ علماء سوء کے تعاون نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا تھا۔ علماءِ حق کو اس نظام سے صرف اسی قدر دلچسپی تھی کہ بادشاہوں کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے کبھی کبھار عید اور جمعہ کی نماز میں شریک ہو جاتے تھے، اس کے سوا وہاں اسلام کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔

اسلام کے اس ظاہری اقتدار کے سبب علماءِ حق ان سلاطین کے خلاف کوئی کھلا قدم اٹھانا پسند نہ فرماتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ معاملہ وعظ و موعظت اور افہام و تفہیم سے طے ہو جائے اور یہ سلاطین صحیح طور پر اسلامی نظام کی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیں[2] لیکن سلاطین کے لیے ناممکن تھا کہ وہ کسی اصلاح کو آسانی سے قبول کر لیں یا فجور و معصیت کو صرف علماءِ حق کی ناراضگی یا نصیحت سے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں۔

جلال الدین اکبر اور اس کے رفقاء کی مفسدانہ مساعی اور اہلِ حق کی اذیت، تخریبِ دین کے لیے منصوبے اور عیاشیوں کی طرف کھلا ہوا رجحان، یہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا تاریک ترین اور کھلا ہوا باب ہے۔ جہاں شیخ محمد طاہر پٹنیؒ ایسے اہل اللہ کی پیش نہ جا سکی،

---

[1] سید محمد جونپوری کی طرف منسوب۔ ع، ح

[2] حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنی ساری عمر ایسی ہی کوششوں میں صرف فرما دی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

نہ دوسرے اہلِ حق کی۔ وہاں اگر جادو چلا تو خانوادہ ملا مبارک کا اور بس۔ فسحقاً لہم۔

## حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ

ان ناگزیر حالات کی بدولت قانونِ الٰہی کے موافق ملاءِ اعلیٰ کی رحمت بھری نگاہیں اس ظلمت کدہ کی طرف متوجہ ہوئیں اور خانوادہ ملا مبارک کی نجاستوں کو دُور کرنے کے لیے ان کی جگہ حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ کے خاندان نے لے لی۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ ملا مبارک کا خاندان بلا الدنیا اکبر کے زیرِ سایہ تھا اور شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ کے لختِ جگر پر صرف خدا کا سایہ۔ ابوالفضل اور فیضی کی بھوک پیاس کا علاج شاہی محلوں اور اکبر کے قدموں میں تھا اور اس خاندان کی ضروریات اور روحانی پیاس کی سیرابی کا سامان حجاز و طیبہ میں۔ فشتان ما بینھما۔ یہ لوگ ایوانِ خسروی سے اتنے ہی بے نیاز تھے جس قدر خانوادہ ملا مبارک ایوانِ خداوندی سے۔ اسی لیے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تحصیلِ علوم کے بعد درسِ حدیث کے لیے حجاز کا رُخ کیا اور فنونِ حدیثیہ کا ایک بیش بہا ذخیرہ حجاز سے ہندوستان کے لیے جمع فرمایا اور سابقہ درسیات کے ساتھ درسِ حدیث کو خاص اہمیت دی اور عمر کا باقی حصہ اسی راہ میں ختم فرما دیا —

طاق و رواق مدرسہ و قیل و قال درس

اینہا بخاک کوئے تو ما در نہادہ ایم

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ کی عمر حسبِ بیان حضرت نواب صدیق حسن خاں مرحوم (ابجد العلوم ص ۹۱۳) قریباً ۶۶ سال (پیدائش ۱۱۱۰ھ اور وفات ۱۱۷۶ھ) ہوتی ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں طوفانی انقلابات کا ہے۔ بیسیوں قوتیں دہلی کے تخت کی آرزو میں بساطِ سیاست پر آئیں اور کامیابی یا ناکامی کے ساتھ ختم ہوئیں۔ بیٹوں نے اپنی سیاسی مصالح کی بنا پر باپ سے بغاوت کی۔ بھائی بھائی سے لڑا۔ غرض اس عرصہ میں قریباً دس بادشاہ دہلی کے تخت پر قابض ہوئے اور اسے چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ کی وفات کے ایام میں برطانوی عقاب تختِ دہلی پر قابض ہونے کے لیے مغل بادشاہوں سے گھوریاں لے رہا تھا بلکہ ایک حد تک

اس کا چنگل اس شکار پر پڑ بھی چکا تھا یہ تو ناممکن ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ ایسا بابصیرت آدمی ان حوادث سے متاثر نہ ہو یا وہ ان نتائج سے بے خبر ہو، جو ان انقلابات کے بعد ان کے پروگرام پر پڑ سکتے تھے، جس کی تکمیل کی ذمہ داری حضرت شاہ صاحبؒ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی تھی، جس کا تذکرہ حضرت شاہ صاحبؒ نے "تفہیمات" میں جا بجا اشارۃً و صراحتہً کیا ہے۔

## شاہ صاحبؒ کا اندازِ اصلاح

شاہ صاحبؒ کی مثال ان حوادث میں اس پہاڑ کی طرح ہے جو سمندر کے کناروں پر واقع ہو۔ سمندر کی موجیں اسے بار بار چھیڑتی ہیں لیکن اس کے سکون میں کوئی جنبش نہیں پیدا کر سکتیں اس کے وقار میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اضطراب بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ شاہ صاحبؒ کی تصانیف میں ان حوادث سے کوئی بے قراری یا قلق محسوس نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک کوہِ وقار جرنیل اپنی اور دشمن فوج کی ساری حرکتوں کو دیکھتا ہے، ناگزیر حالات کو سہارتا ہے اور اپنے پروگرام کی تکمیل کے لیے بڑھا جاتا ہے۔ "حجۃ اللہ البالغہ" کے ابواب میں خلافتِ الٰہی کی تاسیس اور تکمیل کے لیے جو خاکہ بنایا گیا ہے، اس میں بتدریج رنگ بھرا جائے گا اور اس ارادہ کی تکمیل ٹھیک اسلامی تعلیمات کے زیرِ سایہ ہوگی۔ اس کے لیے نہ نعرۂ تکبیر کا ارتعاش مطلوب ہے، نہ "زندہ باد" کی ہنگامہ آرائی۔

مقابل کی صفوں میں سے جہاندار شاہ ہو یا فرخ سیر، کوئی بھی اگر مقاصد سے ٹکرانے کے لیے آمادہ ہو تو ایک تبسم آمیز بے نیازی کے ساتھ اس کی دعوتِ مبارزت قبول فرمائی گئی ہے لیکن اس سیاسی انہماک نے مسلمانوں کی اندرونی بیماریوں سے ایک منٹ کے لیے بے پروا نہیں کیا۔ "فتح الرحمان" کی اشاعت، درسِ حدیث اور ردِ بدعات کا ہر سلسلہ ساتھ ساتھ جا رہا ہے۔ "حجۃ اللہ البالغہ" "تفہیمات" اور "البلاغ المبین" آپ کی تصنیفات پڑھنے والے ان محاذوں کو خوب پہچانتے ہیں، جن پر مجددِ وقت لڑ رہا تھا۔

## حضرت شاہ عبدالعزیزؒ

سنہ ۱۱۷۶ھ میں حضرت مجددِ وقت شاہ ولی اللہؒ کی وفات کے بعد یہ ساری ذمہ داریاں شاہ عبدالعزیزؒ

صاحبؒ کے حصہ میں آئیں۔ آپ کے دور میں ان مقاصد کے تین شعبے ہو گئے۔ سیاسیات وطن درس و تدریس اور پند و موعظت اور ہر شعبہ حسبِ رجحان طبیعت شاہ صاحب کے تلامذہ کے حصے میں آیا اور ہر ایک نے ذمہ داریاں اپنی افتادِ طبیعت کے مطابق اٹھالیں، تاہم معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سب کارگزاریوں کی نگرانی خود فرماتے اور حسبِ ضرورت ہدایات دیتے تھے۔

## خاندانِ دہلی اور حنفیت

فروعِ فقہیہ میں حنفی مسلک کا التزام خاندان میں حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے زمانہ سے ہی اٹھ چکا تھا بعض مشہور مسائل میں وہ حنفی مسلک کے پابند نہ تھے۔ جیسے قرأت فاتحہ خلف الامام؛ چنانچہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نمازِ جنازہ اور دوسری نمازوں میں اس کا التزام فرماتے تھے۔ شاہ ولی اللہؒ نے یہ قصہ اور بھی عریاں کر دیا؛ چنانچہ مولانا شاہ محمد فاخر زائر الہ آبادیؒ کا ورودِ دہلی، آمین بالجہر کی نزاع اور شاہ صاحبؒ کا فیصلہ مشہور واقعہ ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے فتوؤں میں بھی فاتحہ کے متعلق مسلکِ شافعی کی کھلی حمایت پائی جاتی ہے (ملاحظہ ہو فتویٰ مطبوعہ کلکتہ) حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ نے تقلید جامد کے اس پہلو کو بالکل ہی بے نقاب کر دیا، "تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین" لکھ کر حنفی مسلک کی حمایت سے بالکل دستکش ہو گئے اور رفع عند الرکوع و بعد الرکوع کو ترکِ رفع پر ترجیح دی جیسے حضرت شاہ ولی اللہؒ بھی حجۃ اللہ البالغہ میں ظاہر فرما چکے تھے (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۸)

## اظہارِ حقیقت

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ میں حنفی مسلک کے پورے پابند بھی تھے، سید احمد شہیدؒ کے لشکر میں دونوں فریق یا دونوں مسلک کے آدمی دوش بدوش سکھوں سے لڑتے تھے اور آپس میں ان مسائل پر کوئی ادنیٰ سی مخاصمت یا آویزش بھی نہ ہوتی تھی اور حق بھی یہی ہے معاملہ ایک سنت پر عمل یا اس کے ترک سے زیادہ نہیں اور نہ ہی حنفی اور اہلِ حدیث میں کفر و اسلام کا فرق ہے (تقلید شخصی پر جمود سے قطع نظر) ایسے اختلافات سلف سے خلف تک موجود

رہے ہیں۔ ان اختلافات کی بنا پر نہ کسی کی تکفیر عمل میں آئی نہ تفسیق شخصی اجتہاد یا ترجیح سے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ ہر ایک اپنی تحقیق اور صواب دید پر عمل کرنے میں آزاد تھا۔ ایک عجیب حقیقت ہے کہ اس تحریک میں اکثریت علماء کی تھی سکھوں سے جنگ کے بعد انگریز سیاسیین سے بھی مجاہدین کو الجھنا پڑا۔ انگریز شاطر بھی ان مخلصین میں ایسے اختلافات پیدا کرنے سے قاصر رہا۔ یہ سب علم و دانش کی برکت تھی کہ اختلاف کے باوجود وحدت دِ اختلاف کو سمجھ لیا گیا تھا۔ یہی ایک نقص ہے جسے آج ہم اپنے اختلافات میں نہیں سمجھ رہے ورنہ وہ کون سا زمانہ ہے جس میں اختلاف خیال موجود نہ تھا اور یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کی دماغی قوتیں ایسی سطح پر آجائیں جہاں یہ فروعی اختلافات سرے سے ناپید ہی ہو جائیں۔

## تحریکِ اصلاح وجہاد کا مقصد

(متحدہ) ہندوستان میں اس تحریک کے مؤیدین کے سامنے یہ مقاصد تھے۔

(ا) آزادی فکر، تقلید وجمود سے بچ کر کتاب وسنت سے براہِ راست اصول وفروع دینیہ کے سمجھنے کی کوشش کرنا اور ان تالوں کو توڑ دینا جو اس موہبۂ الٰہی کے دروازوں پر لگائے گئے تھے، جسے عقل ودانش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(ب) بدعات ومحدثات کی مخالفت کرنا اور اسلام کی اس سادہ صورت کو سمجھنے اس پر عمل کرنے کی کوشش کرنا، جو قرونِ اولیٰ میں موجود تھی اور جس پر سلفِ اوّل نے عمل کر کے کامیابی حاصل کی تھی۔

(ج) دنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا اور سیاست کے رخ کو اس طرح بدل دینا کہ اسلامی نظام قائم ہو کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے دنیا کے مختلف مذاہب صحیح امن وچین اور مذہبی آزادی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

## شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شاہ اسمٰعیلؒ کے وعظ اور دہلی کے بازاروں کی مجلسوں سے لے کر بالاکوٹ کے اس خو

معرکہ تک جو حق و باطل کی آویزش میں اس نہج کا آخری میدان کارزار تھا، یہ حقیقت نمایاں ہے کہ توحید کی اشاعت، سنت کی ترویج، بدعت کی مخالفت، شرک اور اس کی اسلام سے جنگ اور ہر غیر شرعی نظام کے بدلنے کے لیے کتنے مضبوط ارادوں اور اس راہ میں مصمم عمل سے کام کیا گیا ہے اور اس بے جگری سے کہ دنیا پرست ارباب اسے دیکھ کر عقل و دانش کی راہ سے ان جانبازوں کا محاسبہ کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ رضی اللہ عنہم وارضاھم۔ ایمان صحیح اور خلوص فی العمل ہی ایسے ذرائع ہیں جن سے اس تحریک اور اس کے محرکین کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

## ایک غلطی کا ازالہ

مجھے ان جنگوں کی تفصیلات میں نہیں جانا ہے کہ سکھوں کو کہاں شکست ہوئی اور مجاہدین کہاں کہاں کامیاب ہوئے بلکہ مجھے اس غلطی کو اٹھانا ہے جو "حیاتِ طیبہ" کے مصنف اور اس قسم کے ڈرپوک لوگوں نے اس تحریک کے متعلق پیدا کر دی ہے کہ بانیانِ تحریک کا مقصد صرف سکھوں کے مظالم کو ختم کرنا تھا انگریزی حکومت سے ان کی صلح تھی یا انگریزی مظالم ان کی نگاہ میں قابلِ مواخذہ نہ تھے۔ تحریک کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار تحریک پر سب سے بڑا ظلم ہے۔ ۱۸۶۳ء کا معرکہ جس میں مولانا مقصود علی، مولانا عبداللہ بن مولانا ولایت علی صادقپوری کی قیادت میں شریک تھے۔ جس میں انگریزوں کی طرف سے جنرل نیوی چیمبرس انگریزی عساکر کی قیادت کر رہے تھے۔ یہ معرکہ قریباً چھ ماہ تک جاری رہا۔ ہنٹر نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس معرکہ میں انگریزوں کے قریباً پانچ ہزار آدمی کام آئے اور اسی لڑائی کے نقصان سے جو انگریزوں کو ان خانہ بدوش لوگوں کو خواہ مخواہ چھیڑ کر ہوا لارڈ ایلگن وائسرائے ہند چینی کی پہاڑیوں میں حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئے۔ اس کا تذکرہ مولانا تھانیسری نے "کالا پانی" کے شروع ہی میں کیا ہے اور دعوبی(؟)

مجلہ "الضیاء" لکھنؤ (ہند) شعبان ۱۳۵۵ھ میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اس کے بعد متواتر واقعات ہوتے رہے، جن میں اس لشکر کے بقیۃ السیف انگریزی مظالم سے اس طرح لڑے جس طرح وہ سکھ مظالم سے نبرد آزما ہوئے تھے۔

پیش نظر کتاب میں بھی ان کوششوں کے پس منظر کا تذکرہ ہے جو ان مسلم مجاہدین نے اس راہ میں کیں۔ پٹنہ کے وہابی کیس کی یہ سرگزشت ہے جو پھانسیوں یا عبور دریائے شور کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ مولانا جعفر تھانیسریؒ نے جس سلاست سے ان واقعات کو بیان کیا اور جس سادگی سے اس داستان کو دہرایا ہے وہ اپنی صداقت کی آپ گواہ ہے، اس میں جماعت اہل حدیث کی ان مساعی کو واضح کر دیا گیا ہے جو انہوں نے تخلیص وطن کے باب میں کیں۔ فجزاھم اللہ عنا وعن المسلمین احسن الجزاء۔

## درس و تدریس اور تحریکِ جہاد

تحریک کا شعبہ جہاد جس کی ذمہ داریاں مولانا شہیدؒ کے سپرد تھیں بے حد خطرناک تھا۔ اسے نہ سکھ برداشت کر سکتے تھے اور نہ انگریز۔ اس لیے ۱۸۵۷ء کے بعد ولی اللہی دبستان کا ایک معتد بہ حصہ صرف درس و تدریس، وعظ و خطابت اور شرک و بدعت کی تردید کی طرف راغب ہو گیا اور استخلاصِ وطن کے لیے کسی دوسرے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ اور اپنے مسلک کے موافق دیوبند، سہارنپور اور دہلی میں فقہ و حدیث کے مدارس کھول کر کتاب و سنت کی اشاعت میں اپنے اپنے دائرے پر مشغول ہو گئے، دونوں جماعتوں میں فروعی اختلاف ضرور تھا لیکن عناد اور شقاق بالکل نہ تھا۔

## شیخ الکل مولانا سیّد محمد نذیر حسینؒ کی درسگاہِ حدیث

اس زمانے میں دہلی کی درسگاہ وہابیت کے نام سے زیادہ بدنام ہوئی جس کا سبب غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اصلاح رسوم میں بالکل عریاں اور بے حجاب تھے۔ نیز اس شغل کے باوجود ان لوگوں نے جہاد کے نظام کے قائم کرنے اور

ظالمانہ نظام کے توڑنے میں اپنی کوششوں کو کسی نہ کسی صورت میں جاری رکھا اور اصحاب دیوبند وغیرہ اس فرض کی ادائیگی میں محتاط بلکہ خاموش ہو گئے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں آپ کو اس دور کی اس تحریک کے تذکرہ نگار غالباً تمام کے تمام اہل حدیث ملیں گے بعض لوگ مثلاً مولانا محمد میاں مراد آبادی مؤلف "علماء ہند کا شاندار ماضی" اسے اتفاقی چیز سمجھتے ہیں لیکن یہ صرف اتفاق نہیں بلکہ واقعات کا صحیح نتیجہ ہے یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد ایک گروہ ضرورت سے زیادہ محتاط ہو گیا اور دوسرا گروہ خدمت علم کے ساتھ استبداد کی مخالفت بھی کرتا رہا۔ اسی لیے کچھ حنفی حضرات نے (بریلوی اور لدھیانوی قسم کے) اور کچھ برطانوی حکومت کے ارباب بسط و کشاد نے اس جماعت (اہلحدیث) کو بدنام کیا۔ چنانچہ یہی لوگ "وہابی مقدمات" میں گھسیٹے گئے چنانچہ اسی کتاب کے صفحہ پر مرقوم ہے کہ "مولوی نذیر حسین صاحب جن پہ واسطے اظہار نام کل ممبران اہل حدیث باشندگان ہند کے جبر کیا جاتا تھا رہا ہو کر واپس آ گئے" اور حالانکہ مولانا سید نذیر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا زیادہ تر مشغلہ درس حدیث کا تھا۔ سیاسیات میں ان کو چنداں دلچسپی نہ تھی، مگر ہماری سرکار (انگریزی) کا تو یہ حال ہے کہ غصہ آتا ہی کمزوروں پر ہے۔ حالانکہ حضرت شیخ الکل مولانا الشیخ السید محمد نذیر حسینؒ نے بعض انگریز بچوں اور عورتوں کی ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں مناسب اعانت بھی فرمائی تھی، کیونکہ ایسے معرکوں میں جہاں تک ممکن ہو عورتوں اور بچوں کو نقصان پہنچانے سے شرعاً منع فرمایا گیا ہے۔

## حضرت شیخ الکلؒ کے تلامذہ

حضرت شیخ مولانا سید محمد نذیر حسینؒ (جو شاہ محمد اسحاقؒ کی ہجرت حجاز کے بعد ان کی علمی جانشینی کے سبب "میاں صاحب" کے لقب سے مشہور تھے) کی سیاسیات سے کنارہ کشی اور مشاغل درس کے باوجود میاں صاحبؒ کے تلامذہ سے ایک جماعت استخلاص وطن اور حکومت الٰہیہ کے قیام اور استحکام کے لیے بدستور سرگرم عمل رہی جن میں حضرت شیخنا الاکرم مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری حضرت شاہ عین الحق صاحب پھلواری سوا ہم رحمہم اللہ اجمعین خاص طور پر قابل

ذکر میں جن کا تمام عمر یہی مشغلہ رہا۔ اپنے ذاتی اموال نیز احباب کے بھی زکوٰۃ و صدقات وغیرہ سے مجاہدین ستھانہ (چمرکنڈ و اسمس) کی اعانت فرماتے رہے۔ یہی وہ جرم عشق تھا جس کی پاداش میں مولانا محمد بشیر عرف عبدالرحیم بن (مصنف سلسلۂ کتب اسلام) مولانا رحیم بخش (آف مسجد چینیا نوالی لاہور) ہزاروں روپیہ کی تجارت پر لات مار کر برسوں سوات بنیر کی پہاڑیوں میں سرگرداں رہ کر دہیں ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

یہی حال مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی کا ہے جن کے سیاہ بال یاغستان کی برف میں سفید ہو گئے اور مضبوط صحت کا ایک نوجوان آج مرتعش جسم اور گری ہوئی صحت کے باوجود اسی لیلائے مراد کے وصل کی انتظار میں چمرقند کی سر بفلک پہاڑیوں میں اپنی موت کے دن کاٹ رہا ہے ؎

بجرم عشق توام مے کشند غوغائیست
تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

ان بزرگانِ ملت میں بعض وہ لوگ تھے جنہوں نے اس فریضہ کو اس وقت ادا فرمایا جب کہ بہت سے "علمائے ہند" جن کے "شاندار ماضی" پر آج بعض لوگوں کو ناز ہے ابھی یا تو مستقبل کی آغوش میں محوِ خواب تھے اور یا مدارس اور مساجد کی چٹائیوں کی زینت بن رہے تھے "شاندار ماضی" کے مصنف کی تنگ نظری اگر انہیں علماء میں جگہ نہیں دے سکی نہ سہی مگر جریدۂ عالم کا زیب عنوان ان کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ واقعات کے خاراشگاف قلم نے جس مقام رفیع پر ان کا نام کندہ کیا ہے، کسی متعصب اور تنگ نظر حاسد کی کم نگاہی اسے کبھی مٹا نہیں سکتی سچ ہے ؏

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

**حال** آج جب کہ "کالا پانی" کا یہ ایڈیشن آپ کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے اور یہ چند سطور بطور مقدمہ لکھی جا رہی ہیں، حالت یہ ہے کہ "شاندار ماضی" کے لیے زمین تیار ہو رہی ہیں اور علمائے حال صرف "فاتحہ خلف الامام" اور "نیل الفرقدین"[۱] ایسی تصانیف میں مشغول ہو کر اپنے علم کی داد

---

[۱] مولانا سید محمد انور شاہ مرحوم کی تالیف کردہ ہیں جن میں حنفی اہلحدیث میں متنازعہ ان تین ... ن پُرزور حمایت کی گئی ہے۔ (ع، ح)

لے رہے ہیں اور "فصل الخطاب" کے لیے صرف یہی چند مسائل رہ گئے ہیں جن پر امت مسلمہ کے شاندار یا تاریک مستقبل کا انحصار سمجھا جا رہا ہے۔ ہمارے مدارس کے طلبا دیوبند سے آئیں یا دہلی سے حنفی ہوں یا اہلحدیث ان کی نگاہ میں سب سے بڑا جہاد جدل ومناظرات کی وہ محفلیں ہیں جن میں ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ مالکؒ اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے فروعی اجتہادات پر طبع آزمائی کی جا رہی ہے اور ان خلد مکان بزرگانِ ملت کی فتح وشکست کا جائزہ لینے کی کوشش کی جا رہی ہے غالباً یہ "جہاد" اس لیے فرض قرار دیا گیا ہے کہ انگریز بہادر کی "شریعت" اسے جرم قرار نہیں دیتی ورنہ اس سے بھی کوئی زیادہ شنیع مشغلہ تلاش کرنا پڑتا۔

## خاتمہ

کتاب آپ کے سامنے ہے اور اپنے بزرگوں کے کارنامے ان کے مقاصد کی تفسیر کر رہے ہیں اس راہ کے مصائب، حکومت کی گرفت، اتلاف مال، اتلاف جان غرض منزلِ عشق کے سارے آثار آپ کے سامنے ہیں۔ آپ ہیں اور اپنے مستقبل کی تعمیر آپ کا فرض، حکومت الٰہیہ کی تشکیل آپ کا ذمہ، ماضی کو دیکھیے اور مستقبل کو بنائیے۔ جو راہ آپ کی سربلندی پر منتج ہو سکے اس کی طرف قدم اٹھائیے۔ خدا تعالیٰ کی رحمت ان نیک بندوں کا ساتھ دیتی ہے، جو اس کے قانون کا احترام کریں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فینا لنھدینھم سبلنا۔

## آج کی مشکلات

اس وقت کی مشکلات کی نوعیت گو اس وقت کی مشکلات سے مختلف ہے لیکن عزم وارادہ کی پختگی، تمام مشکلات کا صحیح حل ہے اپنی سربلندی کے لیے کوشش انسانی فطرت کا نہ ٹلنے والا فرض، اس کی مشکلات سے گھبرانا اپنی فطرت سے غداری کے مترادف ہے۔ جماعت اہلحدیث کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ توحید وسنت کی اشاعت اور اسلام کی سربلندی کے لیے بڑھیں۔ انھا لاحدی الکبر من شاء منکم ان یتقدم او یتأخر۔

محمد اسمٰعیل کان اللہ لہ

خطیب مسجد اہلحدیث۔ گوجرانوالہ

بتاریخ $\frac{9}{14}$ ۳

# سخنہائے گفتنی

بارہویں صدی ہجری کے آغاز میں برِ صغیر پاک و ہند کے اُفق پر بادل چھائے ہوئے تھے، سیاہ بادل، شرک و بدعت کے بادل، جہالت و بربریت کے بادل —— وہ مسلمان، جن کے قدوم میمنت لزوم سے یہاں صدیوں قال اللہ وقال الرسول کے دلآویز نغمے روح کو سُرور بخشتے رہے، آج خود اللہ اور رسول سے دور ہو بیٹھے تھے، کتاب وسنت کو یکسر فراموش کر بیٹھے تھے —— وہ مسلمان، مدت مدید اور عرصۂ بعید تک جن کی عظمت و شوکت کے پرچم یہاں لہراتے رہے، آج دَر دَر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے، ان کی سلطنت کا چراغ، چراغ سحر کی طرح ٹمٹما رہا تھا، ان کی جمعیت کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ الغرض مذہبی، علمی، تمدنی اور سیاسی ہر اعتبار سے مسلمان قوم بے انتہا زوال اور انحطاط کا شکار ہو چکی تھی۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی حالت پر ایک بار پھر رحم فرمایا اور برِ صغیر پاک و ہند کے اُفق پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی شخصیت نمودار ہوئی جنھوں نے تاریکیوں اور گمراہیوں کے اس ظلمت کدہ میں حق کے چراغ روشن کیے، جنھوں نے یہاں کے مسلمانوں کی زندگی، عقائد اور اخلاق میں ایک حد تک انقلاب برپا کر دیا لیکن دنیا ابھی کسی دوسرے ہی مردِ میدان کی منتظر تھی۔ یہ مردِ میدان حضرت امام محمد اسماعیل شہیدؒ تھے، جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حقیقی پوتے تھے اور ان کے خواب کی تعبیر بھی۔ امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنے محترم دادا کے مشن کی تکمیل کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ اصلاحِ اعمال و عقائد کے لیے برسرِ بازار وہ کام کیے جن کے کرنے کی بڑے بڑوں کو بند حجروں کے اندر

بھی تاب نہ تھی ۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ آج اگر شاہ ولی اللہؒ بھی زندہ ہوتے تو وہ امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ ہی کے جھنڈے تلے کام کرتے۔

امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ نے ایک طرف دین و عقائد اور اخلاق کی اصلاح کے لیے بے پناہ کام کیا، جہاں جہاں تشریف لے گئے، آپ کے علم و فضل کی بدولت دلبستان کھلتے گئے جن سے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی صدائیں گونج اٹھیں اور "تقویۃ الایمان"، "منصب امامت"، اور "عبقات" وغیرہ کے معطر جھونکوں سے مشامِ جان جھوم جھوم اٹھے۔ دوسری طرف آپ سکھوں، مرہٹوں اور انگریزوں کے آلام و مصائب سے نجات دلانے اور مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ واپس لے کر دینے کے لیے سر پر کفن باندھ کر میدانِ کارزار میں کود گئے حتیٰ کہ اپنے مقدس خون سے بالاکوٹ کی وادیوں کو لالہ زار بناتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئے ؎

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر ز نوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش ازاں خواہی

چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا شہادت بر وجود خود ز خونِ دوستاں خواہی

حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ، ان کے بے مثل پیر و مرشد حضرت سید احمدؒ اور جانباز رفقاء کی شہادت کے بعد، بقیۃ السیف مجاہدین نے دعوتِ اصلاح و جہاد کا علم سرنگوں نہ ہونے دیا بلکہ اس بے سروسامانی کی کیفیت میں جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، اللہ کے نام سے اسے بلند سے بلند تر رکھنے کی کوشش کی اور عزیمت و استقامت کی وہ آگ لگا دی جس کے شعلوں نے پچیس سال تک سکھوں اور ایک سو سال تک انگریزوں جیسی زبردست جابر قوم کو مسلسل آتشِ زیرپا رکھا اور لطف یا ستم کی بات یہ ہے کہ یار لوگوں کو ابھی تک اصرار ہے کہ ان مجاہدین کا جہاد انگریزوں کے نہیں بلکہ صرف سکھوں کے خلاف تھا۔

امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ، ان کے جانباز رفقاء اور ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تحریک کو زندہ رکھنے والے مجاہدین کی یہ داستان ہماری ملی غیرت اور اسلامی حمیت کی سب

سے پُرتاثیر داستان ہے۔ اِن اللہ والوں نے اللہ کی خاطر آلام و مصائب کو برداشت کیا، آتش باریوں اور شمشیر زنیوں کی ہنگامہ آرائیوں میں جانیں دے دیں، خاندان، گھر بار اور جائیدادوں کی قربانیاں دیں، جیل کی کال کوٹھڑیوں اور جزائر انڈیمان یعنی کالا پانی کی بھیانک اور خوفناک وحشت ناکیوں میں دن بسر کیے لیکن جبینِ عزیمت پر کبھی شکن نہ آنے دی اور پائے استقامت میں کبھی لرزش پیدا نہ ہونے دی۔ زندگی کے ہر آرام اور ہر عیش کو نوکِ حقارت سے ٹھکراتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، تمنا تھی تو ایک اور صرف ایک ہی تھی کہ اپنی شہ رگ کے گرم گرم خون سے شجرِ اسلام کو سیراب کریں ؎

لرزتی ہے ان سے نگاہِ حیات
یہی لوگ ہیں حاصلِ کائنات!

انہی "حاصلِ کائنات" قسم کے لوگوں میں سے ایک محمد جعفر تھانیسری بھی تھے۔ آپ تھانیسر ضلع انبالہ کے باشندہ تھے۔ والد صاحب کا نام میاں جیون تھا۔ ۱۸۳۲ء میں ولادت باسعادت ہوئی۔ عمر شریف کی ابھی چند بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ والد کا سایۂ شفقت سر سے اُٹھ گیا۔ ۱۸۵۶ء تک تحریکِ مجاہدین میں باقاعدہ طور پر داخل ہو چکے تھے۔ آپ تحریک کے سینیئر ممبر اور بہت بڑے رازدار تھے۔ سرحد کو روپیہ اور مجاہدین کی فراہمی آپ کے ذمہ تھی۔ آپ علماءِ صادقپور کے معتمد علیہ اور ان کے رازہائے سربستہ کے امین و محافظ تھے۔
جنگِ امبیلہ کے بعد جب ۱۸۶۴ء میں انبالے کا مشہور مقدمہ ظہور پذیر ہوا تو حکومت نے اس یقین پر کہ سرحد پر مجاہدین کی مالی و جانی ہر طرح کی آپ امداد کرتے ہیں، آپ کی خانہ تلاشی کا پروگرام بنایا، آپ نے راہِ فرار اختیار کی تو حکومت نے گرفتاری کے لیے دس ہزار روپے کا اشتہار جاری کر دیا۔ آخر کار علی گڑھ میں پکڑے گئے تو پھر انبالہ لائے گئے، مقدمہ چلایا گیا جس کا ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو فیصلہ سنایا گیا کہ تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط اور پھانسی کی سزا۔ آپ کو ہر طرح کا لالچ بھی دیا گیا اور طرح طرح کے آلام و مصائب کا تختۂ مشق بھی بنایا گیا مگر کسی طرح

بھی آپ کے پایۂ استقلال میں ذرہ بھر جنبش پیدا نہ ہوئی۔ آپ نے اس مقدمہ میں نہایت عزیمت و استقامت کا مظاہرہ فرمایا۔ مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے جج آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:-

"تم بہت عقلمند، ذی علم، قانون دان اور اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس ہو۔ تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا، تمہارے ذمہ سے آدمی اور روپیہ سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا۔ تم نے سوائے انکار بحث کے کچھ جیتاً بھی خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا اور باوجود فہمائش کے اس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی۔ اس واسطے تم کو پھانسی دی جائے گی اور آخر میں یہ کلمہ بھی فرمایا کہ میں تم کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔"

آپ نے فیصلہ سن کر قطعاً کسی قسم کی پریشانی یا گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ فرمایا آخری الفاظ کے جواب میں جج کو نہایت پامردی سے جواب دیا:-

"جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے، آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے۔"

آپ کے یہ الفاظ ایک مظلوم کی زبان سے نکلے ہوئے تھے جو آسمانوں کو چیرتے ہوئے سیدھے عرش بریں تک پہنچے۔ قدرت نے انہیں سچا ثابت کر دکھایا اور چند روز بعد وہ جج اپنی موت آپ مر گیا۔

ادھر پھانسی کی سزا سن کر آپ پر مسرت کی کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ انگریز یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ پھانسی کی سزا کا حکم سننے کے بعد بھی کوئی انسان اس قدر ہشاش بشاش رہ سکتا ہے۔ چنانچہ آپ کو دیکھنے کے لیے جیل میں انگریزوں اور میموں کا تانتا بندھ گیا۔ کسی انگریز نے آپ سے پوچھا کہ پھانسی کی سزا سننے کے بعد یہ مسرت

کیسی ؟ آپ نے ایمان پرور جواب دیا! "راہِ خدا میں جان دینا ہمارے نزدیک بڑی سعادت ہے اور ہمارے دین میں اسے شہادت کہا جاتا ہے"! اللہ اللہ یہ کیا انسان تھے، چڑھتی ہوئی آندھی تھے کہ بڑھتے ہوئے طوفان تھے ؎

ہلاکت نہ تھی موت اُن کی نظر میں
یہ کیا تڑپ تھی! کیا جذبہ تھا!! کیا ایمان تھا!!! ؎
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی!

آخر کار انگریزوں نے آپ کی پھانسی کی سزا کو حبس دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل کر دیا تاکہ شمع حریت کے اس پروانے کو آلام و مصائب کی آگ میں زیادہ سے زیادہ جلایا جا سکے۔ ستمبر ۱۸۶۴ء سے فروری ۱۸۶۵ء تک آپ انبالہ جیل میں ہی پابند زنجیر و سلاسل رہے اور پھر لاہور پہنچا دیئے گئے۔ ۲۲ فروری ۱۸۶۵ء کو لاہور جیل سے روانہ ہوئے اور ملتان، سکھر، ٹھٹھہ اور کوٹری ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔ ایک ہفتہ کراچی جیل میں رہنے کے بعد بادبانی جہاز کے ذریعہ بمبئی روانہ ہو گئے، وہاں ایک ماہ تھانہ جیل میں مقیم رہے ۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو وہاں سے روانہ ہوئے اور آخر کار ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو آپ انڈیمان پہنچ گئے۔ سترہ سال دس ماہ بسر کرنے کے بعد انڈیمان سے ایک بیوی، آٹھ بچے اور آٹھ ہزار روپے نقد لے کر ۹ نومبر ۱۸۸۳ء کو ہندوستان روانہ ہوئے اور ۲۰ نومبر ۱۸۸۳ء کو ۹ بجے شب انبالہ چھاؤنی کے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ اس طرح تقریباً ۱۸ برس کے بعد اس مردِ مجاہد کو وطن کی مقدس سرزمین دیکھنا نصیب ہوئی۔

"کالا پانی" اسی درِ یتیم لعل شب چراغ، یاقوتِ احمر مردِ حق آگاہ محمد جعفر تھانیسری کی خود نوشت سرگذشت ہے، جس میں آپ نے جزائر انڈمان سے واپسی پر احباب کے اصرار پر اپنی گرفتاری، مقدمہ، قید، سفر انڈیمان، انڈیمان کی زندگی کے حالات نہایت

دلنشیں انداز میں تحریر فرمائے۔ یہ کتاب کئی مرتبہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی۔ پہلا ایڈیشن خود مولانا تھانیسریؒ نے اس داستانِ آلام و مصائب کے ختم ہونے کے بعدؒ تواریخ عجیب المعروف بہ تاریخ عجیب" کے نام سے شائع کیا تھا، جو کہ بالکل چھوٹے سائز پر تھا اور اس میں کوئی باب یا ذیلی سُرخی نہ تھی۔ اس ایڈیشن کا ایک نسخہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کی لائبریری میں موجود ہے۔

اس کے بعد صوفی کمپنی منڈی بہاء الدین نے ابواب اور ذیلی سرخیاں قائم کر کے اسکے متعدد ایڈیشن شائع کیے ۱۹۳۵ء میں مکتبہ سلفیہ ملتان نے اور ۱۳۶۳ء میں اقبال اکیڈمی لاہور نے اس کتاب کی اشاعت کی سعادت حاصل کی۔ اسی طرح نفیس اکیڈمی حیدر آباد دکن نے "ایک مجاہد کی ڈائری" کے نام سے عمدہ کتابت و طباعت سے شائع کیا، جب کہ نفیس اکیڈمی کراچی نے "مکتوبات سید احمد شہید" (جو کہ سوانح احمدی کا ایک حصّہ ہے) کے آخر میں اسے بھی ساتھ ہی لگا کر شائع کیا ہے۔ فاروقی کتب خانہ ملتان نے بھی اس کتاب کے بعض ایڈیشن "کالا پانی" اور بعض "اسلامی تحریک کا مجاہد" کے نام سے شائع کیے ہیں۔ موخرالذکر نام سے موسوم ایڈیشن کے آغاز میں "تقریبِ اشاعت" کے نام سے حافظ عبدالمنعم سلیم کا مختصر سا ابتدائیہ ہے جبکہ "اسلامی تحریک کا مجاہد" کے نام سے شاہین فاروقی کا قدرے مفصل اور زوردار پیشِ نظر ہے۔

اس کتاب کا ایک نہایت قابلِ ذکر ایڈیشن سلمان اکیڈمی کراچی نے تواریخ عجیب المعروف بہ کالا پانی" کے نام سے ستمبر ۱۹۶۲ء میں شائع کیا، جسے ہمارے فاضل دوست جناب محمد ایوب صاحب قادری نے مرتب کیا ہے۔ اس ایڈیشن کا تعارف جناب ڈاکٹر محمود حسین صاحب وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی اور پیشِ لفظ جناب جمیل جالبی کے قلم سے ہے۔ جبکہ خود قادری صاحب نے ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے، متن کی تشریح و توضیح کے لیے جابجا حواشی لکھے ہیں۔ کتاب میں مذکور شخصیت ان کے احوال و کوائف "تذکرہ رجال"

کے نام سے مرتب کیے ہیں اور آخر میں جدید رجحان MODERN TREND کے مطابق کتابیات و اشارات کی فہرست بھی دی ہے۔

جناب محمد ایوب صاحب قادری اپنی اس علمی خدمت کے باعث جہاں ہمارے شکریہ کے بطورِ خاص مستحق ہیں، وہاں ہمیں ان سے یہ شکوہ بھی ہے کہ وہ اپنے دقیع اور مفصل مقدمہ میں عدل و انصاف کا مظاہرہ نہ فرما سکے، جس کی ہمیں ان کے علم و فضل سے توقع تھی، چنانچہ سید احمد شہیدؒ اور حضرت امام محمد اسماعیل شہیدؒ کی تحریک جہاد، مجاہدین کی قربانیوں، انگریزوں کی دشمنیوں اور اپنوں کی غداریوں کا اختصار کے ساتھ جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "غیروں اور اپنوں کے اس رویے سے بدنام "وہابی" گھبرا اٹھے اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جہاد کی تحریک اندرون ہند پاکستان قطعی طور سے ختم ہو گئی۔ اپنے لئے "وہابی" کی بجائے "اہل حدیث" کا نام مروج و مشہور کیا۔ انہوں نے باقاعدہ وفاداری حکومت برطانیہ کا اعلان کیا مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے سرکاری تحریرات میں "وہابی" کے بجائے "اہلِ حدیث" لکھے جانے کے باقاعدہ احکام جاری کرائے۔ غرض انگریز نے اپنے بے پناہ مظالم اور شاطرانہ سیاست سے اس اسلامی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ تحریک کا رُخ بدل گیا اور اب وہ چند فروعی مسائل میں اُلجھ کر رہ گئی[1]۔

قادری صاحب کا یہ سارا بیان تاریخی غلطیوں اور غلط فہمیوں کا شاہکار ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ گروہی تعصب کا شدید شکار ہیں۔ سوچی سمجھی سکیم یا کسی مخفی جذبے کی تسکین کی خاطر آپ آئے دن اس قسم کی "تحقیق" پیش فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ یہ "تحقیق" جو آپ نے "کالا پانی" کے اس مقدمہ میں پیش فرمائی ہے، اسے من و عن اپنے اس مقد

[1] مقدمہ "تواریخ عجیب" از محمد ایوب قادری ص ۲۹ - ۳۰

میں بھی دوہرا چکے ہیں جو آپ نے حیاتِ سید احمد شہیدؒ (نفیس اکیڈمی کراچی) پر لکھا ہے بلاکم وکاست ان خیالات کا اظہار اپنی تازہ کتاب "جنگِ آزادی" میں بھی کیا ہے۔ آپ نے اپنے خیالات کا اظہار غالباً سب سے زیادہ کھل کر "سر سید احمد خاں اور وہابی تحریک" نامی اس مضمون میں کیا تھا جو جولائی سن ۱۹۷۰ء کے "البلاغ" کراچی اور "چٹان" لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اسی وقت ہمارے فاضل دوست جناب مولانا عبدالخالق صاحب قدوسی لاہور نے تیرہ قسطوں پر مشتمل اپنے ایک مفصل، مکمل مستند اور مدلل مضمون میں قادری صاحب کی اس تحقیق کا پوسٹ مارٹم کیا تھا، جو کہ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور میں شائع ہوا تھا[1]۔ خیال تھا کہ ان ٹھوس تاریخی دلائل و براہین کو دیکھ کر قادری صاحب اپنے خیالات پر نظر ثانی فرمائیں گے۔ افسوس کہ قادری صاحب کی تازہ کتاب "جنگِ آزادی" دیکھ کر ہماری یہ خوش فہمی غلط ثابت ہوئی اور انہوں نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ "کل اٰیۃ او حدیث یخالف ماعلیہ اصحابنا فھو ماؤل او منسوخ"۔

قادری صاحب کی ایک بار پھر اس تحقیق کو دیکھتے ہوئے خیال ہوا کہ ہم بھی "کالا پانی" کے اس مقدمہ میں اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے جائیں۔ لیھلك من ھلك عن بینۃ ویحیٰی من حیّ عن بینۃ۔

قادری صاحب کے مقدمہ سے پیش کیے ہوئے مذکورہ اقتباس سے بھی پہلے ان کے یہ ارشادات پڑھیے۔

"حقیقت یہ ہے کہ انگریز نے تحریکِ جہاد کو بری طرح کچلا۔ مجاہدین اور مصلحین کو وہابی کے نام سے موسوم کرکے بدنام کیا گیا۔ تمام ملک میں وہابیوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا۔ مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں سے ان کے حالات اور سرگرمیوں کی کیفیت طلب کی۔ ایک محکمہ سراغ رسانی اسی مقصد

[1] ملاحظہ فرمائیے جلد نمبر ۲۲ شمارہ ۸ تا ۱۲، ۱۴ تا ۱۵، ۲۰ تا ۳۲، ۳۵ تا ۳۸۔ اشاعت ۱۹۷۰ء

کے لیے وجود میں آیا۔ حکومتِ انگریزی نے باغی اور وہابی مترادف الفاظ قرار دیتے۔ عامۃ المسلمین میں ان کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کیا اور ایک عام معاشرتی انقطاع شروع کیا گیا[1]۔"

تحریک جہاد اور مجاہدین کی اس شکست و ریخت کے سلسلہ میں گزارش یہ ہے کہ انگریزوں کے طرزِ عمل کا شکوہ بیجا ہے، آخر وہ تو دشمن تھے، ان سے ہر بات کی توقع تھی۔ مجاہدین نے جب انہیں تقریباً سو سال تک آتشِ زیر پا رکھا تو انہوں نے بھی انتقام کے لیے ہر ممکن حربہ اختیار کیا۔ افسوس تو اپنے میر صادقوں اور میر جعفروں پہ ہے۔ انگریزوں سے شاید ہمیں اتنا نقصان نہ پہنچا ہو جتنا کہ اپنوں کی غداریوں اور سازشوں سے۔ قادری صاحب کو بتانا چاہیئے تھا کہ یہ سراغ رسانی کے فرائض انجام دینے والے کون تھے؟ نفرت کا جذبہ کن لوگوں نے پیدا کیا؟ اور یہ انقطاع کرنے والے کون تھے؟

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سیدین شہیدین کی جماعت میں اہل حدیث اور احناف دونوں گروہ موجود تھے اور ان کی برکت سے شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں لیکن حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ محمد اسمعیل شہیدؒ کی شہادت کے بعد جب جماعت کی زمام اہلحدیث بزرگوں کے ہاتھ آئی تو علماءِ احناف آتشِ حسد سے جل اٹھے، چنانچہ انہوں نے تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی، تعاون سے انکار کر دیا اور دن بدن دور سے دور تر ہوتے چلے گئے چنانچہ حنفی مکتبِ فکر کے مشہور بزرگ مولانا کرامت علی جونپوری، جو کہ سید صاحب کے خلفاء میں سے تھے، ان کے متعلق خود قادری صاحب رقمطراز ہیں کہ :-

"آپ نے انگریزی حکومت کی موافقت میں جہاد کے خلاف فتویٰ دیا تھا[2]۔"

---

[1] مقدمہ "کالا پانی" از محمد ایوب قادری ص ۲۸ - ۲۹

[2] تذکرہ علماء ہند ص ۳۹۶

اسی طرح مولانا مسعود عالم ندویؒ نے بھی ان کے متعلق لکھا ہے کہ :-

مجاہدین اور اتباع سید احمد شہیدؒ کے سب سے بڑے واقف کار مسٹر جیمس اوکنلی نے شہادت دی ہے کہ مولوی کرامت علی صاحب برطانوی حکومت کے مؤید اور وہابیوں کے پکے مخالف تھے۔ یہ تصدیق نامہ راج محل (بہار) میں ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۸۷۰ء کو دیا گیا، جسے خود ان کے پوتوں نے فخریہ سنہ ۱۹۱۴ء میں درج کرایا تھا (وہ خوبصورت اور نظر فریب پمفلٹ راقم کی نظر سے گزر چکا ہے) اس میں ان کے صاحبزادے اور مشہور ادیب مولوی عبدالاول صاحب جونپوری اور حافظ احمد صاحب کی وفاداری کی بھی تصدیق ہے۔ اس کے علاوہ راقم یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ عقائد و اعمال میں وہ سید صاحب کے اصحاب خاص کی روش سے بالکل الگ تھے۔[1]

نہ صرف یہ کہ علماء احناف نے تحریکِ جہاد سے علیحدگی اختیار کرکے اس کی مخالفت شروع کر دی بلکہ انگریزوں کے ساتھ الفت و محبت کے رشتے قائم کیے، سرکاری ملازمتیں اختیار کیں اور مکمل وفاداری کا ثبوت دیا۔ دیوبندی تحریک کے امیر اول مولانا مملوک علی ساری زندگی سرکاری ملازمت سے وابستہ رہے اور مکمل وفاداری اور کامل انہماک اور خلوص کے ساتھ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے دن رات مسلسل محنت کرتے رہے، چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی رقمطراز ہیں :-

"نانوتہ میں مظاہر العلوم کے مدرس اوّل مولانا محمد مظہر نانوتوی، احیاء العلوم کے مترجم مولانا محمد احسن نانوتوی، دیوبند میں مولانا ذوالفقار علی (حضرت شیخ الہند کے والد ماجد) مولانا فضل الرحمٰن (مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد ماجد) اور اس قسم کے بیسیوں بزرگ جو ہم پاتے ہیں علم و فضل کے ساتھ مشہور ہیں، ان

---

[1] ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۷۴۔ حاشیہ

میں سے بعض حضرات انگریزی حکومت کی طرف سے محکمہ تعلیمات کے انسپکٹر بھی تھے۔ مثلاً شیخ الہند کے والد ماجد اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد ماجد دونوں حضرات کا جو حال ہے، جہاں تک میرا خیال ہے اس علاقہ کی اس جدید علمی روشنی میں بہت زیادہ دخل مولانا مملوک علی کے وجود باوجود کو ہے۔ دلی پہنچنے اور وہاں کی تعلیمی سہولتوں سے مستفید ہونے کا موقع ان بزرگوں کو بظاہر مولانا مملوک علی کی وجہ سے میسر آیا[1]"

مولانا مملوک علی کے اکثر تلامذہ کی کیفیت بھی بالکل یہی تھی، مولوی سمیع اللہ آپ کے مشہور شاگرد ہیں، انگریزوں کو ان پر بڑا اعتماد تھا یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے انہیں ایک خاص مشن پر مصر بھی بھیجا، چنانچہ جناب قادری صاحب نے خود بھی ان کے متعلق لکھا ہے کہ :-

"۱۶ ستمبر ۱۸۸۲ء کو مولوی سمیع اللہ مصر میں انگریزوں کے استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولیٹیکل مشن پر مصر گئے اور وہاں انہوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک کو نقصان پہنچایا۔ ان خدمات کے صلہ میں ان کو سی۔ ایم۔ جی کا خطاب ملا[2]"

اسی طرح مولانا محمد احسن نانوتوی، دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد ماجد مولانا فضل الرحمٰن، مولانا محمود الحسن کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی اور دیگر بے شمار اکابر علماء احناف کی اکثریت کسی نہ کسی طرح سرکار انگریزی سے منسلک ہوگئی اور رسم شبیری ادا کرنے کے لیے اکیلے اہل حدیث میدان میں رہ گئے۔ تعجب ہے کہ قادری صاحب انگریزوں کی ستم رانیوں کا تو ذکر کرتے ہیں اور ان برادران یوسف کی نوازشوں کو بھول جاتے ہیں۔ انگریزوں کی بربریت سے شاید اس قدر نقصان نہ پہنچا ہو جتنا کہ

---

[1] سوانح قاسمی بحوالہ "مولانا محمد احسن نانوتوی" ص ۲۳ [2] "مولانا محمد احسن نانوتوی" ص ۱۸۴

اپنوں سے آہ ــہ

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ ہر چہ کرد با من آشنا کرد

"اگر ایک طرف ولیم ولسن ہنٹر نے "آور انڈین مسلمانس" لکھ کر ان کے خلاف حکومت کو مواد مہیا کیا تو دوسری طرف مولانا فضل رسول بدایونی (ف ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء) اور ان کے تلامذہ نے غریب "وہابیوں" کے خلاف تصنیفات کا ایک انبار لگا دیا۔[1]"

فضلِ رسول بدایونی اور ان کے ہمنواؤں کو چھوڑو کہ ان کا اوّل و آخر مقصد ہی پیٹ کی پوجا اور انگریز بہادر کی خوشنودی تھی۔ فضل رسول بدایونی نے اگر ان پاکباز مجاہدین اور ان کے افکار و نظریات کی تردید میں اپنا پورا زورِ قلم صرف کر کے "سیف الجبار" "احقاق الحق و ابطال الباطل" "البوارق المحمدیہ لرجم الشیاطین النجدیہ" "تصحیح المسائل" اور مجموعہ رسائل و فوائد وغیرہ کتب لکھیں تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کیونکہ وہ انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے اور انہیں حق نمک ادا کرنا ہی تھا، انہیں اپنے آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا ہی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کی تو اکثر و بیشتر کتب بھی سرکاری ملازمین کی اعانت ہی سے شائع ہوئی ہیں فضل رسول بدایونی اور ان کے ہم نواؤں کی اس "خدمتِ اسلام" کی تفصیل کے لیے دیکھئے ہماری کتاب "تذکرہ شہید" سردست سوال یہ ہے کہ کیا فضلِ رسول بدایونی اور اس کے تلامذہ کی نسبت ارباب دیوبند کا کردار مختلف تھا؟ کیا انہوں نے اہل حدیث پر مسجدوں کے دروازے بند نہ کیے؟ معاشرتی انقطاع نہ کیا؟ ان کے خلاف فتوے مرتب نہ کیے؟ کتابیں نہ لکھیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس مقدس مہم کے آغاز کا سہرا ہی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے جدِ امجد مولوی محمد لدھیانوی کے سر ہے، جنہوں نے "انتظام المساجد باخراج اہل الفتن والمفاسد"

[1] مقدمہ کالا پانی ص ۲۹

نامی "کتاب مقدس" میں ان "غریب وہابیوں" کو مرتد قرار دیا اور حکام بالا سے ان کے قتل کا مطالبہ کیا اور اسی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ اسلاف دیوبند نے مولوی محمد لدھیانوی کو مزید کمک پہنچانے کے لیے ایک اور فتویٰ کا اہتمام کیا، جس کا نام تھا "جامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد" اور اس پر لدھیانہ، دیوبند، گنگوہ، رامپور، پانی پت اور دیگر بہت سے شہروں کے مفتیانِ احناف کی مہریں اور دستخط ثبت تھے۔ کالا پانی کے مقدمہ میں تو قادری صاحب نے صرف بدایونی صاحب اور ان کے تلامذہ کا ہی ذکر کیا لیکن مقامِ مسرت ہے کہ وہ گھر کے بھیدوں سے بھی آگاہ ہو گئے ہیں اور اب انہوں نے مولوی محمد لدھیانوی، مولوی وصی احمد سورتی ثم پیلی بھیتی اور مولوی نبی بخش حلوائی کی ان "خدمات جلیلہ" کی طرف بھی دبی زبان سے اشارہ کر دیا ہے۔

اسی زمانہ میں سرتاجِ اہل حدیث اور سرخیل مجاہدین حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی کے ساتھ اربابِ دیوبند خصوصاً حاجی امداد اللہ صاحب مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولوی خیر الدین اور مولوی عبد القادر بدایونی نے سرزمین حجاز میں جو "حسنِ سلوک" کا مظاہرہ فرمایا وہ تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولوی محمد حسن سنبھلی، مولانا محمد قاسم نانوتوی حتیٰ کہ مولانا عبد الحی صاحب لکھنوی جیسے علماء دین نے اہل حدیث کے خلاف جس لب و لہجہ میں گوہر افشانی فرمائی، وہ تاریخ کے اوراق میں ثبت ہے۔ مولوی محمد حسن سنبھلی نے تو اس "قند کوثر و تسنیم" میں دھلی ہوئی زبان استعمال فرمائی کہ بدایون والوں کے حاشیۂ خیال پر بھی نہ کھٹکی ہو گی۔ ملاحظہ فرمائیے "تنظیم الفرائد حاشیہ شرح عقائد"۔

اس سارے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے قادری صاحب کے ان ارشادات کو ایک بار پھر پڑھیئے، جو پہلے اقتباس میں مذکور ہیں اور پھر خود انصاف سے فرمائیے کہ حکومت برطانیہ کے وفادار اہلحدیث مجاہدین تھے یا اربابِ دیوبند؟ اگر عدل وانصاف

کے دامن کو تھام کر تاریخ کے صفحات کی ورق گردانی کی جائے تو یہ حقیقت طشت از بام ہو جائے گی کہ جب بڑے بڑے اصحاب جبہ و دستار، دیوبند اور سہارنپور کے مدرسوں کے بند حجروں کے اندر بھی انگریزوں کے خلاف کوئی بات منہ پر لانے کی جسارت نہ کر سکتے تھے، تو وہ صرف اہل حدیث جانباز ہی تھے جو انگریز سورماؤں کو لوہے کے چنے چبوا رہے تھے۔ جناب قادری صاحب خود ہی انصاف سے فرمائیں کیا یہی "وفاداری حکومت برطانیہ" ہے؟

وہابیوں پر وفاداری حکومت برطانیہ کا بے بنیاد الزام عائد کرنے کے بعد جناب قادری صاحب نے حضرت مولانا محمد حسن بٹالوی رحمہ اللہ کو اپنی تحقیق کا بطور خاص تختۂ مشق بنایا ہے، چنانچہ آپ مذکورہ اقتباس میں قادری صاحب کا یہ ارشاد پڑھ چکے ہیں :۔

"مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے سرکاری تحریرات میں وہابی کے بجائے لکھے جانے کے باقاعدہ احکام جاری کرائے[1]"

اسی طرح انہوں نے اپنے مضمون "سرسید احمد خاں اور وہابی تحریک" میں بھی اس الزام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا :۔

"اس سلسلہ میں مولوی محمد حسین بٹالوی کی نمایاں خدمات ہیں۔ انہوں نے ایک رسالہ اشاعۃ السنہ خاص اسی مقصد کے لیے جاری کیا کہ وہابیوں کو گورنمنٹ کے قریب تر کر سکیں۔ انہوں نے جہاد کی منسوخی پر نہ صرف مضامین لکھے بلکہ مستقل ایک رسالہ الاقتصاد فی مسائل الجہاد لکھا[2]"

اور اب پھر یہی الزام انہوں نے اپنی تازہ کتاب "جنگِ آزادی" میں ان الفاظ میں دوہرایا ہے کہ :۔

مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے سرکاری تحریرات

---

[1] مقدمۂ "کالا پانی" ص ۲۹ [2] ہفت روزہ چٹان

میں وہابی کے بجائے اہلحدیث لکھے جانے کے باقاعدہ احکام جاری کرائے مولوی محمد حسین بٹالوی نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی منسوخی پر ایک مستقل رسالہ "الاقتصاد فی المسائل الجہاد" ۱۲۹۲ھ میں لکھا"

ان مذکورہ اقتباسات سے درج ذیل اعتراضات والزامات نمایاں طور واضح ہو رہے ہیں :۔

۱۔ مولانا نے "اشاعۃ السنہ" خاص اس مقصد کے لیے جاری کیا کہ وہابیوں کو گورنمنٹ کے قریب تر کر سکیں۔

۲۔ مولانا نے وہابی کے بجائے "اہلحدیث" لکھے جانے کے باقاعدہ احکام جاری کرائے۔

۳۔ انہوں نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی منسوخی پر نہ صرف مضامین لکھے بلکہ مستقل ایک رسالہ الاقتصاد فی مسائل الجہاد لکھا۔

اب ہم انتہائی اختصار کے ساتھ قادری صاحب کہ ان الزامات کا جائزہ لیتے ہیں۔ پہلا اعتراض "اشاعت السنہ" کے مقصدِ اجراء پر ہے اور یہ اتنا بے بنیاد اعتراض ہے کہ ہم اسے افتراء یا کذب محض سے تعبیر کر سکتے ہیں کیونکہ جو لوگ اشاعت السنہ کے اجراء کے پس منظر اور ابتدائی پرچوں میں اس کے مدیر کی طرف سے بیان کردہ اغراض ومقاصد سے آگاہ ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس رسالہ کا مقصد تقلید اور نیچریت کی تردید تھا۔ یہاں ہم خود مولانا بٹالوی کی شہادت پیش نہیں کریں گے کہ شاید وہ قادری صاحب ایم اے کے ہاں معتبر نہ ہو لہذا ہم یہاں سرسید احمد خاں کی شہادت نقل کرتے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب لاہوری ہر مہینہ ایک رسالہ نکالتے ہیں، جس کا نام اشاعۃ السنہ ہے۔ یہ رسالہ دراصل انہوں نے اپنے چھوٹے بھائیوں کی خدمت گزاری کے لیے نکالا تھا یعنی اس زمانہ میں جن کو لوگ وہابی

کہتے ہیں۔ دو فرقوں میں منقسم ہو گئے ہیں ایک وہابی مقلد دوسرے وہابی لامذہب یا غیر مقلد جو اپنے تئیں موحد یا اہل حدیث کے نام سے موسوم ہونا پسند کرتے ہیں اور وہ لوگ جو بدعتی کہلاتے ہیں پہلے فرقہ کو چھوٹے بھائی اور دوسرے فرقہ کو بڑے بھائی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں[1]"

اس سے ثابت ہوا کہ مولانا بٹالوی کے اشاعۃ السنہ جاری کرنے کا مقصد اپنے بھائیوں — مقلدین — کو راہِ راست پر لانا تھا، چنانچہ ابتداء میں یہ رسالہ تقلید اور اشاعتِ سنت ہی کے لیے وقف تھا لیکن بعد میں جب سرسید مرحوم اور نیچریت کا چرچا ہوا تو مولانا نے "اشاعۃ السنہ" کا رخ اس طرف پھیر دیا۔ یہی وجہ ہے حالی نے "تہذیب الاخلاق" کی تردید میں شائع ہونے والے رسالوں میں "اشاعت السنہ" کیا ہے۔ الغرض قادری صاحب کا یہ دعویٰ کہ اجراء کا مقصد اہلِ حدیث کو انگریز حبیب کرنا تھا، انتہائی بے بنیاد اور بے دلیل ہے اگر ان کے پاس کوئی دلیل ہو تو لائیں۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین!

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے وہابی کے بجائے اہلِ حدیث لکھے جانے کے احکام جاری کرائے۔ گویا مولانا بٹالویؒ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اہلِ حدیث کو ایجاد کیا۔ یہ بالکل وہی اعتراض ہے جسے نئے انداز اور نئی تحقیق سے پیش کی کوشش کی گئی ہے، جو اس زمانہ میں بعض نیم خواندہ یا غیر محقق لوگ کیا کرتے ہیں اہلِ حدیث کی ابتداء زیادہ سے زیادہ ایک صدی یا اس سے کچھ اوپر کی ہے۔ کسی فرقہ کی جدت یا قدامت کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے جس کی طرف منسوب ہے اس کا تعلق کس زمانہ سے ہے اس اصول کے مطابق اہلِ حدیث کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ اصول اپنی ذاتی شہادت سے بغیر کسی خارجی دلیل

---

[1] الاخلاق پرچہ اول شوال ۱۲۹۶ھ منقول حاشیہ از اشاعۃ السنہ ج ۲ شمارہ ۶ ضمیمہ ص ۱

کی احتیاج کے ببانگِ دہل اعلان کر رہا ہے کہ اہلِ حدیث اسی وقت سے ہیں جب سے حدیثِ مصطفےٰ ہے اور اہلِ حدیث کا اصل اصول ہی یہ ہے ؎

اصلِ دیں آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیثِ مصطفےٰ بر جان مسلّم داشتن

بحمد اللہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارا کوئی عقیدہ، کوئی عمل اور کوئی طریقِ عبادت ایسا نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سکھایا یا ارشاد فرمایا ہوا نہ ہو یا کم از کم عہدِ صحابہ میں اس پر عمل نہ ہوتا ہو۔ اگر آپ تفصیل کے ساتھ اہلِ حدیث کی قدامت کے دلائل اور ان کے افکار و عقائد کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں تو ہم امام العصر حضرت مولانا حافظ محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کی "تاریخ اہلِ حدیث" اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب محدّث گوجرانوالہ رحمۃ اللہ علیہ کی "تحریکِ آزادیٔ فکر" کے بغور مطالعہ کی دعوت دیں گے۔ مختصر طور پر صرف یہ عرض کریں گے کہ برِصغیر پاک و ہند کو سب سے پہلے اپنے قدومِ میمنت لزوم سے نوازنے والے بزرگ تابعی حضرت ربیع بن صبیح السعدی البصریؒ ہوں یا وہ مقدس قافلہ جس نے سب سے پہلے فاتحانہ حیثیت میں ساحلِ ہند پر ورود فرمایا یہ سب اہلِ حدیث تھے لہٰذا یہ اعتراض کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ اہلِ حدیث کا آغاز کوئی سوا سو سال سے ہوا ہے یا بقول قادری صاحب مولانا محمد حسین بٹالویؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس نام کو اختیار کیا بلکہ انگریز سے اس کے باقاعدہ احکام جاری کرالئے۔

جناب قادری صاحب کا مولانا بٹالویؒ پر تیسرا اعتراض یہ تھا کہ انہوں نے جہاد کی منسوخی پر نہ صرف مضامین لکھے بلکہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" کے نام سے ایک مستقل رسالہ بھی لکھا۔ قادری صاحب کا یہ اعتراض بھی سراسر اتہام اور افتراء ہے جس کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ کتاب کا نام ہی اس الزام کی تردید کر رہا ہے اے کاش انہوں نے اس پر غور فرمایا ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ قادری صاحب نے شاید یہ کتاب نہیں

دیکھی بلکہ سنی سنائی باتوں پر اعتراض کی بنیاد رکھی ہے یا پھر قادری صاحب عربی سے اسقدر ناواقف معلوم ہوتے ہیں کہ وہ "اقتصاد" اور "نسخ" کے فرق کو نہیں سمجھ سکے۔ عربی سے ناواقفیت کے اس شبہ کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اپنی کتاب "جنگِ آزادی" کے ص ۴۴ پر مولانا کی اس کتاب کا نام "الاقتصاد فی المسائل الجہاد" لکھا ہے، جو کہ کتابت کی غلطی معلوم نہیں ہوتی بلکہ محسوس یوں ہوتا ہے کہ جیسے "اقتصاد" اور "نسخ" کے فرق کو نہیں سمجھ سکے، شاید اسی طرح یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ "مسائل الجہاد" مرکب اضافی یہاں درست ہے یا "المسائل الجہاد" مرکب توصیفی!

مولانا بٹالوی کے رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" کے متن سے تو کیا اس کے بین السطور یا کسی حاشیہ میں بھی منسوخیٔ جہاد کے متعلق ایک لفظ تک نہیں بلکہ اس رسالہ کا پس منظر اور سببِ تصنیف صرف یہ ہے کہ جس دور میں انگریزوں نے مجاہدین کو اپنے ظلم وستم کا تختۂ مشق بنا رکھا تھا اور برادران احناف بھی اپنے مجاہدین بھائیوں کے بجائے انگریز بہادر کی طرف دستِ تعاون دراز فرما رہے تھے، تو انہی دنوں مسلمان مجاہدین کے ازلی و ابدی دشمن ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی رسوائے زمانہ کتاب

لکھی جس نے انگریزوں کے ظلم واستبداد کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اپنی صلیبی ذہنیت کے مطابق آنجہانی ڈاکٹر ہنٹر نے اس کتاب میں اسلام اور مسلمانوں پر بے بنیاد الزامات عائد کیے، اسلام کو چند تشدد آمیز اصولوں کا مجموعہ قرار دیا اور عام مسلمانوں کی طرح یہی تاثر دیا کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے نیز اس نے لکھا کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی غیر مسلم حکومت کی ماتحتی کو تسلیم نہ کرے بلکہ انہیں اپنے ملک سے نکال دے یا خود ہجرت کی راہ اختیار کرے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ اسلام میں ہر حالت میں جہاد فرض ہے اس لئے ہندوستانی مجاہدین بغاوت پر مجبور ہیں الغرض ہنٹر نے اپنی اس کتاب کے باب "وہابیت" میں اسلام پر نہایت رکیک حملے کیے اور اہلحدیث کے

خلاف انگریزوں کو بہت اکسایا کیونکہ اس وقت صرف یہی ان کے خلاف برسرِپیکار تھے
مولانا بٹالویؒ نے جب ہنٹر کی کتاب میں ان سب سروپا اعتراضات کو ملاحظہ فر
انہوں نے خالص علمی اور نہایت متین انداز میں ایک ایک کی تردید فرمائی اور نام اس کا "الا
فی مسائل الجہاد" رکھا۔ اپنے اس رسالہ میں مولانا نے کتاب وسنت اور کتب فقہ کے
کی روشنی میں اسلام کے نظریۂ جہاد کی وضاحت فرمائی اور لکھا کہ جہاد کی فرضیت کے
کچھ شرائط ضروری ہیں، جب تک وہ متحقق نہ ہوں، جہاد فرض نہ ہوگا، چنانچہ مولاناؒ نے
جہاد کی غرض و غایت کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

"مذہبی جہاد نہ اس غرض سے مشروع ہے کہ کافروں کو دنیا میں کفر کی سزا
دیں اور نہ اس غرض سے ہے کہ ان کو جبراً مسلمان کریں۔ اس جہاد سے غرض
جو خدا اور رسول کی کلام سے سمجھ میں آتی ہے یہ ہے کہ مسلمانوں کو مخالفین مذہب
کی مخالفت بے جا سے بچائیں اور خدا کی عبادت (جو مخلوق کی پیدائش اور
رسولوں کی بعثت سے مقصودِ خداوندی ہے) کا راستہ صاف کریں اور اس راستہ
سے روکنے والوں کو راستہ سے ہٹا دیں۔[۱]

الغرض یہ تھی وہ بات جسے قادری صاحب نے بتنگڑ بنا دیا ہے یہ سعادت تو صر
اسلاف دیوبند اور ارباب بدایون و بریلی کے حصہ میں آئی تھی کہ انہوں نے جہاد کی مخالفت ا
انگریزوں کی موافقت میں فتوے دیئے۔ رہے "وہابی" یا "اہل حدیث" مجاہدین اسلام
انہیں ایک طرف برادرانِ یوسف نے تہمت تراشیوں کا ہدف بنا رکھا تھا تو دوسری طرف
انگریزوں نے آلام ومصائب کا تختۂ مشق اور یہ عزیمت واستقامت کا پہاڑ بنے ہوئے
کہہ رہے تھے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں اہلِ حق کیساتھ یہی ہوتا چلا آیا ہے ۔

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو ؛ کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

---

[۱] الاقتصاد فی مسائل الجہاد ص ۹

آخر میں مجھے ایک بات اور بھی عرض کرنا ہے اور وہ یہ کہ ماضی قریب میں ہمیں جن صدمات سے دوچار ہونا پڑا ان میں سے امیر المجاہدین حضرت صوفی محمد عبد اللہ صاحبؒ بانی دار العلوم تعلیم الاسلام ماموں کانجن ضلع لائلپور اور حضرت مولانا سید ابو بکر غزنویؒ وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا راہگرائے عالم جاودانی ہونا سر فہرست ہے۔

حضرت صوفی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو تو اللہ تعالیٰ نے جہاد میں عملی طور پر شرکت کی سعادت بخشی تھی، وہ اسمٰعیل شہیدؒ کے قافلہ کے آخری سالار تھے۔ ان کا ہر بُن مو راہِ خدا میں جہاد کی محبت سے سرشار تھا۔ ان کی مجلس میں جب جہاد کا ذکر آتا تو ان کی بوڑھی رگوں کے خون کی گردش اور سفید بالوں کی چمک دمک تیز ہو جاتی اور اس رُخ آتشیں کی تب و تاب میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ آہ! اس مردِ مجاہد کے وصال سے ہماری صفوں میں کتنا عظیم خلا پیدا ہو گیا۔

آہ! ۲۵ اپریل ۱۹۷۶ء کی شام بھی کس قدر یاس انگیز تھی، جب کہ لندن کے اُفق پر پاکستان ہی نہیں عالمِ اسلام کا ایک بے مثل آفتاب غروب ہو گیا تھا، میری مراد حضرت ابو بکر غزنویؒ سے ہے۔ خاندانِ غزنویہ کے چشم و چراغ، بطلِ حریت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کے لختِ جگر اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر حضرت سید ابو بکر غزنویؒ کے متعلق یہ تو سب جانتے ہیں کہ مرحوم پیکرِ شرافت، مجسمِ اخلاق اور نہایت منکسر المزاج تھے۔ مرنجانِ مرنج طبیعت کے مالک تھے، جس محفل میں ہوتے کشت زعفران بن جاتی، مزاج کے درویش، دل کے بادشاہ، دماغ کے غنی، زبان کے دھنی، علم و فضل کے پہاڑ، حسنِ عمل کے بحرِ زخار، تہجد گزار اور شب زندہ دار تھے۔ معلوم ایسا ہوتا کہ احسن الخالقین نے حب الٰہی، عشقِ رسول، علم و عمل، سوز و گداز اور حسن و جمال سے ایک آئینہ بنایا اور نام اُس کا ابو بکر غزنوی رکھ دیا لیکن شاید یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان تمام اوصافِ حسنہ کے ساتھ

ساتھ آپ کے قلبِ اطہر میں ولولۂ جہاد بھی نہایت شدت سے موجزن تھا اور آپ حضرت امیر المجاہدین صوفی محمد عبداللہ صاحب کی معیت میں تحریک احیائے دین کی تنظیم کے لیے بھی بے پناہ تڑپ رکھتے تھے۔ آپ نے مجاہدِ ملت سردار عبدالقیوم صاحب سابق صدر آزاد کشمیر کے نام ۱۹۶۵ء میں اپنے ایک مکتوب میں اس عزم کا اظہار فرمایا تھا کہ:

"وقت کا اہم تقاضا ہے کہ حضرت مولانا فضل الٰہی صاحب کی تحریک مجاہدین کو منظم اور باضابطہ طور پر از سر نو زندہ کیا جائے۔"

تحریکِ مجاہدین کے سلسلہ میں مثبت اور ٹھوس لٹریچر کی اشاعت کو بھی آپ نہایت ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ راقم الحروف کے ذمہ بھی انہوں نے دو عنوانات پر کام کرنا لگایا تھا جسے ان شاء اللہ ضرور کیا جائے گا سرِدست مجھے ان دونوں مقدس شخصیتوں سے محبت رکھنے والوں کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آیئے

صحیح طور پر ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔

علمی خاکوں میں رنگ بھریں۔

تحریک احیائے دین کو زندہ کریں۔

اور

ذکر و فکر الٰہی کی مجلسوں کو گرم کریں۔

---

کتاب کو تصنیف ہوئے چونکہ ایک سو سال کا عرصہ ہو رہا ہے۔ اتنے طویل عرصہ میں زبان نے کئی قلابازیاں کھائی ہیں، بے شمار الفاظ و محاورات ایسے ہیں جو کل رائج تھے لیکن آج متروک ہو چکے ہیں یا ان کی شکل و صورت میں تغیّر رونما ہو چکا ہے۔ ایسے الفاظ و محاورات ہمارے جدید قارئین کرام کی طبع نازک پہ بہت گراں گزرتے ہیں۔ لہٰذا قارئین کرام کی اس مشکل کو برادر عزیز محمد سرور طارق نے اس طرح حل فرما دیا ہے کہ انہوں نے جدید انداز میں اس

کتاب کو مرتب کر دیا ہے، جس سے کتاب کے آبدار گیسوؤں میں پہلے کی نسبت بے پناہ آب و تاب پیدا ہوگئی ہے۔ لہٰذا وہ ہماری طرف سے شکریہ اور مبارکباد کے بطورِ خاص مستحق ہیں۔

برادرِ عزیز محمد سرور طارق، اپنے پہلو میں ایک دردمند اور حسّاس دل رکھنے والے صالح نوجوان ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ اس کم سنی اور نوخیزی کے عالم میں اس بات کے کتنے شدید متمنی ہیں کہ تحریکِ جہاد میں پھر سے زندگی کی رُوح پھونکی جائے۔ اسماعیل شہیدؒ کے جلائے ہوئے چراغ کی روشنی کو جلا بخشی جائے اور سرزمین پاکستان میں آئینِ محمدی کے نفاذ کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو کھپا دیا جائے جبکہ ان کے ہم عمروں کے حاشیۂ خیال پر بھی اس قسم کی باتیں نہیں کھٹک سکتیں۔ سچ ہے ؏

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

اس قسم کے صالح جذبات ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ انہوں نے "کالا پانی" جیسی ولولہ آفریں کتاب کی ترتیب و تہذیب کے فرائض انجام دیئے تاکہ قارئین کرام اس سے بآسانی استفادہ کر سکیں۔ خدا تعالیٰ ہمارے بھائی کی عمر میں برکت فرمائے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار

ستاروں پر کمند ڈالنے والے ایسے شاہین صفت جوان ہی قوم کا اصل سرمایہ ہیں، ہمیں مستقبل میں ان سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ برادرم طارق صاحب کی خدمت میں یہ گزارش ہے ؎

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ!

۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ

محمد خالد سیف

# پیش لفظ

انڈمان سے واپسی کے بعد جب ہر دوست نے مجھ سے میری بیس سالہ قید، سفر اور ان جزائر کی کیفیت پوچھنی شروع کی تو میرے لیے ہر ایک کے سامنے بیس سالہ تاریخ کو بیان کرنا نہایت دشوار تھا۔ اس لیے مَیں نے اس مدت میں پیش آنے والے اہم واقعات کو نہایت اختصار کے ساتھ سپردِ قلم کر دیا ہے تاکہ ہر سائل اور مستفسر کے سامنے اس کتاب کو پیش کر دوں۔

جب اپریل ۱۸۷۹ء میں مَیں نے تاریخ پورٹ بلیر مسمّی بہ "تاریخ عجیب" لکھی تھی تو اس سے چند دن قبل گورنر جنرل ہند نے میری رہائی کی درخواست کو مسترد کر دیا تھا، جس سے اکثر حکام بلکہ خاص و عام کو یقین ہو گیا کہ اب قیدِ فرنگ سے مجھے کبھی نجات نہیں ملے گی لیکن میں رحمت الٰہی سے نا اُمید نہیں ہوا تھا اس لیے مَیں نے کتاب مذکور کے دیباچہ میں لکھ دیا تھا " دنیا بامید قائم ہے، دیکھیئے پردۂ غیب سے اور کیا ظاہر ہوتا ہے"۔ بلکہ دیباچہ کے اختتام پر ناظرین کرام کی خدمت میں التجا بھی کی گئی تھی کہ وہ میرے حق میں دُعا کریں کہ ہماری سرکار اس خاکسار کو ان ننگ دھڑنگ جنگلیوں کی صحبت سے جُدا کر دے تاکہ اس کتاب کی جلد دوم ہندوستان آکر اپنی ملکی زبان میں ھدیۂ ناظرین کر سکوں۔

اس دل سوز تحریر کو ابھی چند روز ہوئے تھے کہ میری درخواست کے بغیر غیبی مدد سے میری رہائی کا سامان ہو گیا اور لارڈ رپن نے میری رہائی کا اعلان کر دیا۔ میری پہلی کتاب "تاریخ عجیب" کا نام بھی تاریخی ہے اور اتفاقِ حسنہ کی بات ہے کہ صرف ایک حرف زیادہ کر دینے سے اس کتاب کا نام "تواریخ عجیب" بھی تاریخی ہو گیا (۱۲۹۲ھ) اور اس طرح چھ برس کی زیادتی بھی پوری ہو گئی۔ گویا یہ اس کتاب کی جلد دوم ہے، جس کا وطن واپس آکر لکھنے کا

وعدہ کیا تھا۔

ناظرین باوقار کی خدمت میں عرض ہے کہ میں نے اس کتاب کو روزمرہ کی بول چال میں لکھا ہے اور جہاں تک مجھے یاد تھا دوسرے لوگوں کے مقولوں اور واقعات کو من وعن نقل کیا ہے۔ اس کے باوجود اگر تقاضائے بشریت کے مطابق مجھ سے کہیں کمی بیشی ہوئی ہو تو خداوند عالم الغیب مجھے معاف فرمادے اور نکتہ چین اصحاب اور اہلِ قلم جہاں کہیں غلطی دیکھیں اپنے قلم عفو سے اصلاح فرمادیں اور میرے حق میں دعا کریں کہ جیسے اس عظیم ہلاکت انگیز قید فرنگ سے نجات بخشی، ایسے ہی وہ ربّ کریم دلی مراد پوری کردے اور خاتمہ بالخیر کے ساتھ اس ہلاکت دنیا سے بھی نجات بخشے۔ آمین ثم آمین وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :-

| | |
|---|---|
| اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ لَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ؁ | کیا لوگ یہ خیال کیے ہوئے ہیں کہ (صرف) یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی اور جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں ہم نے ان کو بھی آزمایا تھا اور ان کو بھی آزمائیں گے) سو خدا ان کو ضرور معلوم کرے گا جو (اپنے ایمان میں) سچے اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں۔ |

جہاں تک مجھے سمجھ اور علم ہے اس مقدمہ میں ہماری گرفتاری، اس آیت شریفہ میں بیان کردہ منشاایزدی کے مطابق صرف سچے اور جھوٹوں کی پہچان اور آزمائش کے لیے تھی ورنہ وعدہ حق موجود ہے کہ "وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا" - اگر یہ ہماری آزمائش نہ ہوتی تو ہمیں کبھی بھی انگریزی سرکار سے صدمہ نہ پہنچتا اور بفحوائے حدیث نبوی :-

يُبْتَلَى الرَّجُلُ عَلَىٰ حَسْبِ دِيْنِهٖ — آدمی کی دین وایمان کی استعداد کے مطابق آزمائش ہوتی ہے۔

اس مقدمہ میں ایمان کے دعویٰ داروں کی آزمائش کی گئی اور ظاہر کیا گیا ہے کہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے کون تھے اور سچے کون ؟ یہ کتاب ——— تواریخ عجیب المعروف بہ کالا پانی ——— گویا اس آیت مذکورہ بالا کی تفسیر ہے۔

اس تمہید کے بعد اب اصل مقدمہ ابتدا سے انتہا تک بیان کرتا ہوں ۔ اگر ناظرین کرام اس آیت مبارکہ اور حدیث شریف کے مضمون کو ذہن میں رکھیں گے تو ان پر واقعات کے اسرار و رموز خود بخود آشکارا ہوتے چلے جائیں گے لیکن یاد رکھیئے کہ ان کے سمجھنے کے لیے ایمان درکار ہے ... ——— میں خود اپنی کم ظرفی ، بے استعدادی اور ضعیف الایمانی کے سبب اس مقدمہ کے ہزاروں مخفی اسرار کو سمجھ نہ سکا ۔

محمد جعفر تھانیسری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# معرکہ امبیلا

۱۸۶۳ء بمطابق سنہ ۱۲۸۰ھ کے آخر کی بات ہے کہ مغربی ہند کی سرحد کے قریب انگریزی سرکار کی زبردستی کی وجہ سے ایک عظیم جنگ شروع ہوگئی۔ جنرل چیمبرلین صاحب اس جنگ کے سپہ سالار تھے۔ امبیلے کی گھاٹی میں پہنچ کر سرکاری فوج کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بیگانے ملک میں سرکار کی بے جا مداخلت کو دیکھ کر ملا عبدالغفور صاحب اخوند سوات بھی اپنے بہت سے مریدوں کو ساتھ لے کر آموجود ہوئے۔ ملکی خوانین اور افغان بھی اپنے بچاؤ کے لیے چاروں طرف سے سرکار پر ٹوٹ پڑے اور مجاہدین کا وہ قافلہ اس کے علاوہ تھا، جن کی سرکوبی اور نیست و نابود کرنے کے لیے چڑھائی کی تھی۔ الغرض بدعوی حفاظت خود اختیاری ہر کس و ناکس سرکار کے مقابل کھڑا ہوگیا۔ مجاہدین نے حصولِ شہادت کے جذبہ سے سرشار ہوکر شجاعت کے خوب خوب جوہر دکھلائے۔ یہ ہنگامہ جنگ و جدل دو تین مہینے جاری رہا اور تقریباً سات ہزار کشت و خون میں تڑپ گئے، خود جنرل چیمبرلین شدید مجروح ہوئے۔ پنجاب کی تمام چھاؤنیوں کی فوج کو اس جنگ میں جھونک دیا گیا تھا۔

ادھر یہ ہنگامہ برپا تھا اُدھر لارڈ ایلجن وائسرائے ہند اپنی اس حرکت پر نادم ہوکر راہیِ ملکِ عدم ہوا اور ہندوستان بے گورنر ہوگیا۔

## سازش کا انکشاف

ایسے نازک وقت میں ۱۱ دسمبر ۱۸۶۳ء بمطابق ۲۸ جمادی الثانی سنہ ۱۲۸۰ھ کو ایک ولایتی افغان غزن خان نے

جو کہ پانی پت ضلع کرنال کی چوکی میں بطور پولیس سوار متعین تھا، کسی ذریعہ سے میرے حالات معلوم کیے اور اپنے دنیوی فائدے کی خاطر ایک لمبی چوڑی اور جھوٹی داستان ڈپٹی کمشنر کرنال کو سنائی اور کہا کہ سرحد پر ہندوستانی مجاہدین سے لڑی جانے والی جنگ میں، تھانیسر کا مرزا محمد جعفر مجاہدین کی روپیہ اور آدمیوں سے مدد کر رہا ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے یہ داستان سنی تو بذریعہ تار ضلع انبالہ میں خبر بھیج دی کیونکہ ہمارا شہر تھانیسر اسی ضلع میں واقع ہے۔

مخبر داستان سرائی کر کے باہر نکلا ہی تھا کہ ہمارے ایک دوست ڈپٹی کمشنر کرنال کی ملاقات کے لیے ان کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ جن سے گفتگو کے دوران ڈپٹی کمشنر نے اس مخبری کا ذکر بھی کیا۔ ملاقات کے بعد جب وہ دوست اپنے ڈیرے پر تشریف لائے تو انہوں نے اپنے ایک نوکر کا وانائی سے جو میرا ہمسایہ تھا بطورِ افسوس اس واقعہ کا ذکر کیا۔ کا وا اسی وقت مجھے اطلاع دینے کے لیے تھانیسر دوڑ پڑا۔ جب تھانیسر پہنچا تو رات کافی بیت چکی تھی۔ سب سے پہلے میرے مکان پر آیا لیکن میں اندر سو رہا تھا۔ اس نے جب دروازہ بند دیکھا تو آرام کے وقت میں تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا اور یہ سوچا کہ صبح کے وقت اطلاع دے دوں گا۔ حقیقت یہ تھی کہ تقدیر اسے دروازے پر سے ہٹا لے گئی۔

اب انبالہ کی کیفیت سنیئے۔ جب یہ تار انبالہ پہنچا تو میری خانہ تلاشی کے لیے وارنٹ جاری ہوا اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کپتان پارسن، پولیس کی ایک بھاری جمعیت کے ساتھ راتوں رات میرے مکان پر پہنچ گیا۔ قدرت الٰہی کا تماشہ دیکھئے! ایک ہی وقت میں دو آدمی روانہ ہوتے ہیں۔ ایک کرنال سے مجھے خبر دینے کو اور دوسرا انبالہ سے میری خانہ تلاشی کو، کرنال والا جو میرا خیر خواہ تھا پہلے پہنچا اور کچھ نہ کر سکا ؎

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو

سوزنِ تدبیر ساری عمر گر سیتی رہے

دوسرے صاحب رات کے تین بجے میرے گھر پر پہنچ گئے، چاروں طرف سے مکان

محاصرہ کرنے کے بعد مجھے باہر بلایا - جب باہر نکلا تو دیکھا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس، خانہ تلاشی کے وارنٹ لیے میرے دروازہ پر موجود ہے - اُس نے وارنٹ دکھائے اور کہا کہ مکان کی تلاشی ہوگی - مَیں اسی وقت سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے - مَیں نے سوچا کہ تلاشی پہلے گھر کے اندر کی ہو جائے تو بہتر ہے تاکہ بیٹھک میں رکھا ہوا خط پولیس کے ہاتھ نہ لگے لیکن جو ہونا ہے اسے کون روک سکتا ہے ؟ باوجودیکہ صدر دروازہ کی اندرونی دہلیز میں بالکل اندھیرا تھا اور بیٹھک کا دروازہ اُتر شمالی جانب تھا، بالکل نظر نہیں آتا تھا، لیکن سپرنٹنڈنٹ صاحب اسی پر مصر ہوئے کہ پہلے بیٹھک ہی کی تلاشی لی جائے -

بیٹھک میں داخل ہونے کے لیے دو دروازوں کا کھلوانا ضروری تھا، جو کہ اندر سے بند تھے - مَیں نے چالاکی سے منشی عبدالغفور کا نام (جو اس کے اندر چند آدمیوں کے ہمراہ موجود تھے) لے کر بلند آواز سے کہا کہ "سپرنٹنڈنٹ صاحب تلاشی کے لیے کھڑے ہیں، تم جلد دروازہ کھول دو" اس سے میری غرض یہ تھی کہ کسی طرح وہ لوگ تلاشی کی بات سمجھ کر، دروازہ کھولنے سے پہلے اس زہریلے خط کو چاک کر دیں - سپرنٹنڈنٹ نے میری پکار کو سمجھتے ہوئے مجھے روکا لیکن میں کب سنتا تھا - بیٹھک کے اندر والے گھبراہٹ میں میرے اشاروں کو نہ سمجھ سکے اور انہوں نے دروازہ کھول دیا - اب بیٹھک میں تلاشی ہونے لگی تو جس خط کا ڈر تھا، سب سے پہلے وہی پولیس کے ہاتھ لگا - اسی شام کو پکڑے جانے سے چھ گھنٹے پہلے تقدیر نے وہ خط میرے ہاتھ سے رکھوا رکھا تھا، خط امیرِ قافلہ کے نام تھا اور اس میں اصطلاحی لفظوں میں چند ہزار اشرفیوں کی رسید کا ذکر تھا - اس کے علاوہ چند خطوط پارینہ بھی پولیس کے ہاتھ لگ گئے، جو کہ محمد شفیع انبالوی نے پٹنہ سے ارسال کیے تھے، اگرچہ ان خطوط میں کوئی مضر بات نہ تھی مگر ان سے پولیس کو شفیع انبالوی اور اہلِ پٹنہ مثلاً مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم اور مولانا احمداللہ وغیرہ (جو اس وقت تحریکِ مجاہدین کے اربابِ حل وعقد تھے) کی تلاشی و تفتیش کا بہانہ ہاتھ آ گیا -

منشی عبدالغفور جو کہ بہار کے ضلع گیا کے باشندے تھے اور میرے پاس محرری کا کام

کیا کرتے تھے اور ایک لڑکے عباس نامی کو، جو بیٹھک میں سویا ہوا تھا، پولیس پکڑ کرلے گئی۔ اگرچہ میری نسبت انہیں قوی شک ہو گیا تھا لیکن وارنٹ گرفتاری اور گورنمنٹ کی منظوری کے نہ ہونے کی وجہ سے جو کہ ایسے مقدمات میں ضروری ہے، پولیس نے مجھ سے کچھ تعرض نہ کیا۔

**فرار**

پولیس کی واپسی کے بعد، یہ بات غور طلب تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ مَیں نے اس خیال سے کہ چونکہ میرے گھر سے ثبوت مل گیا ہے اور جنگِ سرحد کی وجہ سے حکومت کے غصّہ کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے فرار ہو جانا اور بزدلی سے جان بچانا مناسب سمجھا۔ اگرچہ میں پولیس کی حراست میں نہیں تھا مگر وہ چاروں طرف سے میرا سُراغ لگاتے ہوئے، میری حرکات کو تاک رہے تھے۔

مَیں نے اپنی والدہ ماجدہ جو کہ اس وقت بقیدِ حیات تھیں اور اپنی بیوی سے صلاحُ مشورہ اور انہیں اپنے فرار پر راضی کر کے یہ داؤ کھیلا کہ میں ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو اپنے شہر سے روانہ ہو کر اوّل موضع پیپلی میں، جہاں تحصیل اور تھانہ وغیرہ ہے، آیا اور تحصیل اور پولیس کے ملازمین سے بھی رائے لی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ سب نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ تم انبالہ جاؤ اور وہاں سے دریافت کرو یہ کیا مقدمہ ہے اور کس نے یہ مخبری کی ہے؟

یہ سب صلاح مشورہ کرنے کے بعد مَیں بوقت شام براستہ سڑک کلاں پیپلی سے نکل کر انبالہ کو روانہ ہو گیا۔ اس وقت بہت سے آدمی چشمِ محبت اور افسوس سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جب میں ایک گھوڑے پر سوار ہو کر چلا تو ہر کسی کو یقین ہو گیا کہ مَیں انبالہ جا رہا ہوں۔ جب تک دن کی روشنی رہی مَیں برابر سڑک پر انبالہ کی طرف چلتا رہا۔ کوئی میل بھر راستہ چلنے کے بعد جب خوب تاریکی پھیل گئی اور مسافر بھی دُور دُور تک نظر نہ آتے تھے، تو مَیں نے سڑک کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور تھانیسر کے متصل اپنی زمین میں مقررہ جگہ پر ایک بجے رات پہنچ گیا۔

جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ والدہ ماجدہ، بیوی، بچے اور بھائی محمد سعید میری آخری ملاقات کے لیے انتظار کر رہے ہیں۔ والدہ سے آخری ملاقات کر کے اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر ایک

ایک بہلی پر سوار ہوئے اور تیئیس میل کا فاصلہ طے کر کے صبح پانی پت پہنچ گئے۔ مَیں شہر کے اندر نہ گیا بلکہ سڑک ہی سے بیوی بچوں کو رخصت کر دیا۔ اس وقت مَیں جس سے بھی رخصت ہوتا تھا، زندگی میں دوبارہ ملنے کی امید نہ تھی۔ بہلی والے سے مَیں نے کہا کہ میرے بیوی بچوں کو پانی پت میں چھوڑ کر تم بہلی لے کر جمنا پار چلے جانا۔ یہ بہلی مع بیلوں کی جوڑی، جو تین سو روپیہ سے کم قیمت کے نہیں ہیں، ہم نے تمہیں اس شرط پر بخش دی کہ کسی کو میرے بال بچوں کی خبر نہ دینا اور جب تک یہ معرکہ گرم رہے تھانیسر نہ جانا۔ جس وقت ڈاک خانہ پانی پت کے سامنے میں ساری عمر کے لیے اپنے بیوی بچوں سے جُدا ہوا اور میرا بچہ ان کے سامنے دہلی کو چلا، وہ حادثہ ناقابلِ بیان ہے۔ آج بھی وہ ایک ایک لمحہ میرے ذہن پر نقش ہے اور شب و روز کی گردشوں کے باوجود میں اسے بھول نہ سکا۔

**دہلی** ٹانگہ کے ذریعہ چالیس میل کا سفر طے کرنے کے بعد، دوسرے دن دہلی پہنچ گیا اور وہاں میاں نصیر الدین کی کوٹھی میں قیام کیا۔ میاں حسینی ساکن تھانیسر، حسینی ساکن پٹنہ اور عبداللہ نامی ایک بنگالی سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں مؤخر الذکر پٹنہ سے کچھ اشرفیاں لے کر، اسی دن آئے تھے۔ مَیں نے وہ اشرفیاں اُن سے لے کر حسینی ساکن تھانیسر کے حوالہ کرتے ہوئے اسے ہدایت کر دی کہ جیسے ممکن ہو اس بیت المال کو قافلہ تک پہنچا دو۔

حسینی تھانیسر کو روانہ کرنے کے بعد، مَیں نے ان دونوں کو اپنے ساتھ پورب لے جانا چاہا کیونکہ معرکہ امبیلا اور میرے مکان کی تلاشی کے بعد پنجاب میں امن نہیں رہا تھا۔ اس وقت میں نے عمر کی ابھی تک صرف پچیس بہاریں دیکھی تھیں لہٰذا اس شباب کے زمانہ میں مذہبی جوش جنون کی حد تک تھا اور زمانہ کے نشیب و فراز کا کچھ خیال نہ تھا۔ بس ایک لگن تھی کہ یہ خدا کا کام ہے، وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ میری تلاشی انبالہ اور اس کے مغرب میں ہو رہی ہوگی، اس طرف میری تلاش میں کون آئے گا۔

**علی گڑھ** اس مذکورہ خیال کے باعث دہلی پہنچ کر، میں نے اپنے تئیں مخفی رکھنے کو ضروری

نہ سمجھا۔ اس لیے آزادی سے گھومنے پھرنے لگا۔ ایک دفعہ اپنے معمولی لباس میں چاندنی چوک تک بھی گیا تاکہ سواری کے لیے کرایہ کی شکرم وغیرہ کا انتظام کیا جاسکے۔ ۱۵ دسمبر کو ہم تینوں کھلم کھلا شکرم پر سوار ہو کر علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں گاڑی بان کو بہت سا انعام و اکرام دے کر چاہا کہ جس قدر ممکن ہو علی گڑھ جلد پہنچ کر ریل پر سوار ہو جائیں۔ مجھے پختہ یقین تھا کہ جس چال سے آیا ہوں، شاید کوئی مدت تک بھی میری تلاش کو ادھر نہ آئے۔ میں اپنی تدبیر پر اتنا نازاں تھا کہ تقدیر کا خیال بھی نہ رہا تھا۔ اب مجھے یہیں چھوڑیئے اور پولیس انبالہ کی کارروائی سنیئے!

۱۲ دسمبر کو جب سپرنٹنڈنٹ پولیس میرے خطوط اور ان آدمیوں کو جو میرے گھر سے ملے تھے، انبالہ لے گیا تو ان کو دیکھ کر گورنمنٹ نے میری گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے، وہی سپرنٹنڈنٹ پارسن جب میرے وارنٹ گرفتاری لے کر دوسرے دن تھانیسر آیا، تو اس نے مجھے وہاں نہ پاکر شہر میں آفت مچا دی، سینکڑوں گھروں کی تلاشی ہوئی، پچاسوں مرد عورت پکڑے گئے، بوڑھی والدہ، بھائی محمد سعید ——— جو اس وقت صرف بارہ تیرہ برس کا تھا ——— اور اس کی بیوی کو قید کر کے ان پر سخت تشدد اور مار پٹائی شروع کر دی گئی۔ پردہ نشین عورتوں کو اس قدر آلام و مصائب کا تختۂ مشق بنایا گیا کہ سن کر دل لرزا اٹھتا اور رونگٹے کانپ جاتا تھا۔ میری بیوی کی گرفتاری کے لیے پولیس کی ایک جمعیت پانی پت دوڑی، مگر مولانا حنفی الاسلام صاحب کی جوانمرد والدہ کی دلیری سے میری بیوی بچ گئی۔ ان ظلم و تشدد کا نشانہ بننے والوں میں سے میرا بھائی محمد سعید جو کہ نہایت کم سن، لذتِ ایمانی سے ناآشنا اور فضائلِ ثابت قدمی سے سراسر بے بہرہ تھا، اس سخت مار پیٹ کی تاب نہ لاسکا، ڈر گیا اور جان بچانے کے لیے بول اٹھا کہ میرا بھائی دہلی گیا ہے۔ یہ خود میری غلطی تھی کہ ایسے اہم راز پر ایک نابالغ بچے کو آگاہ کر دیا تھا، جس کا نتیجہ میری گرفتاری کی شکل میں برآمد ہوا۔ جب میرے بھائی نے راز کا انکشاف کر دیا تو پارسن سے لے کر گاڑی کے ذریعہ دہلی پہنچ گیا۔

ادھر پنجاب میں جا بجا میری تلاشی شروع ہوگئی حتیٰ کہ میری گرفتاری کے لیے دس ہزار روپیہ کا انعامی اشتہار جاری ہوا۔ انبالہ کیمپ میں محمد شفیع کے مکان کی بھی تلاشی ہوئی، اتفاق سے وہ اس وقت گھر پر موجود نہیں تھے بلکہ لاہور گئے ہوئے تھے۔ ان کے بھائی محمد رفیع اور ان کے کارندے مولانا محمد تقی اور منشی عبدالکریم وہاں موجود تھے لہٰذا ان کو گرفتار کر لیا گیا اور ڈرایا گیا کہ اگر تم صورتِ حال سے آگاہ نہیں کرو گے، تو تمہیں تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔ جان کے ڈر سے محمد رفیع اور محمد تقی نے محمد شفیع کے خلاف شہادت دے دی اور پولیس کے کہنے کے مطابق گواہی دے کر اپنی جان بچائی۔ منشی عبدالغفور نے شہادت نہ دی لہٰذا انہیں بلا قصور محمد شفیع کے ساتھ عمر قید کر دیا گیا۔

پارسن صاحب دہلی پہنچے تو انھوں نے یہاں بھی آفت مچا دی، سراؤں اور شہر کے دروازے بند کر دیئے، ہزاروں آدمیوں کی تلاشی ہوئی، پچاسوں آدمی پکڑے گئے، اسی پکڑ دھکڑ میں پارسن کو یہ علم ہو گیا کہ میں فلاں شکرم میں سوار ہو کر فلاں وقت دو دوسرے آدمیوں کے ہمراہ علی گڑھ کی طرف روانہ ہوا ہوں، انہوں نے اسی وقت تار برقی کے ذریعہ علی گڑھ میری گرفتاری کے لیے خبر کر دی۔

## علی گڑھ میں گرفتاری

علی گڑھ میرے گھر سے دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔ جب ہم علی گڑھ پہنچے تو اسی وقت تار پہنچ گیا۔ لہٰذا اسی وقت بر لبِ سڑک پولیس نے آ کر ہمیں گھیر لیا اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ علی گڑھ کے بنگلہ پر لے گئے، اس نے ہمیں مجسٹریٹ صاحب کے پاس بھیج دیا۔ جہاں مجھے اور میرے دونوں ساتھیوں کو تار کے جواب ثانی آنے تک حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اسی دن شام کو جب میں تیمم کر کے نماز پڑھ رہا تھا، پارسن صاحب وہاں پہنچ گئے اور مجھے قید میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور حکم دیا کہ "اس کو پھانسی گھر میں نہایت حفاظت کے ساتھ بند کر دو۔" حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور مجھے ایک بڑی تنگ و تاریک اور کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا اور گرد دو تین پہرے دار

متعین کر دیئے گئے۔

پھانسی گھر میں بند ہو کر مجھے عقل آئی کہ اس فرار اور تدبیر پر فخر خداوند تعالیٰ کی مرضی کے خلاف تھا۔ اس فرار سے یہ مقدمہ بہت بھاری ہو گیا اور پھر مجھے یا میرے عزیزوں اور دوستوں کو جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، وہ اسی فرار نابکار کا ثمرہ تھا۔ آزمائش کے وقت بھاگ جانا سچے عاشقوں کا کام نہیں ہوتا۔ بقول حافظ ؎

بیگانہ را چہ کار بود در بلائے غم
آنرا رسد کہ خاص بود آشنائے ما

علی گڑھ کے پھانسی گھر میں قید تھا کہ ایک رات پہرے دار پوچھنے لگے "پھانسی والے مجرم پر بھی صرف ایک پہرہ ہوتا ہے، تم ایسا کیا قصور کر کے آئے ہو کہ جس سے تم پر تین پہرے لگائے گئے ہیں"؟ میں نے جواب دیا "میں جس آقا کا غلام تھا، اس کے حکم کے بغیر بھاگ نکلا لہٰذا وہ ناراض ہو گیا اور مجھے راستہ ہی سے پکڑوا دیا۔"

## جیل میں ناقص خوراک

جیل کا کھانا سب سے پہلے اسی جیل میں چکھا، جو دو روٹیوں اور تھوڑے سے ساگ پر مشتمل تھا۔ ساگ میں موٹے موٹے ڈنٹھل تھے، پتی کا نام تک نہ تھا۔ اس لیے ان کا چبانا بھی دشوار تھا۔ روٹیوں میں چوتھائی کے قریب ریت اور مٹی ملی ہوئی تھی۔ خدا کا شکر ادا کر کے اس میں سے تھوڑا بہت کھایا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً اکثر جیل خانوں میں رہ کر دیکھا، سب جگہ قیدیوں کو اسی طرح کا کھانا ملتا تھا۔ دراصل بات یہ ہے کہ قیدیوں کو خوراک کم ملتی ہے، جس سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ جب انہیں گندم پیسنے کے لیے دی جاتی ہے، تو وہ بھوک کے مارے سیروں گندم چبا جاتے ہیں یا کچا آٹا پانی میں گھول کر پی لیتے ہیں اور آٹے کا وزن پورا کرنے کے لیے آٹے میں مٹی یا ریت ملا دیتے ہیں اسی طرح جو عمدہ ترکاری جیل کے باغوں میں پیدا ہوتی ہے، اس کو تو فروخت کر دیتے ہیں یا جیل کے عہدہ دار کھا جاتے ہیں اور ناکارہ ڈنٹھل جن کو جانور بھی نہیں کھاتے، کاٹ

کاٹ کر قیدیوں کے لیے پکا دیئے جاتے ہیں ۔ وہ بھوکے اسی کو غنیمت جان کر ہاتھوں ہاتھ اڑا جاتے ہیں، اگرچہ نئے قیدیوں کو ایک دو دن ضرور دقت ہوتی ہے، مگر جب بھوک سے پیٹ میں قراقر اٹھتے ہیں تو پلاؤ قورمے سے بھی زیادہ اس میں مزہ پاتے ہیں اور کھا جاتے ہیں کیونکہ دنیا میں اصل مزہ بھوک کا ہے ——!

## امتحانِ عشق

دوسرے دن پارسن صاحب خوشی خوشی ہم تینوں آدمیوں کو لے کر بذریعہ شکرم دہلی روانہ ہوا۔ شکرم میں سوار ہونے سے پہلے مجھے بیڑی، ہتھکڑی اور طوق پہنا کر اور طوق میں بطور باگ ڈور ایک زنجیر ڈال کر اور اس کا سرا ایک مسلح سپاہی کے ہاتھوں میں دے کر اس کو میرے پیچھے بٹھایا ۔ پارسن صاحب اور دوسرا انسپکٹر پولیس میرے دائیں بائیں بھرے ہوئے تمنچوں کی جوڑیاں لے کر اور میرے بدن سے بدن ملا کر بیٹھ گئے ۔ راستہ میں پارسن مجھے بار بار کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی، تو میں اس تمنچے سے تمہیں مار ڈالوں گا ۔

علی گڑھ سے دہلی تک کھانا پینا تو درکنار، کسی سخت ضروری حاجت کے لیے بھی ہمیں نہ اتارا گیا ۔ جب نماز کا وقت آتا، تو میں اجازت کے بغیر ہی تیمم کر کے بیٹھے بیٹھے اشاروں سے نماز پڑھ لیتا تھا ۔ گاڑی بدستور سوئے منزل رواں دواں رہتی اور وہ چپ چاپ میری نماز کا تماشا دیکھا کرتے تھے ۔ آخر کار بڑی مصیبت کے ساتھ، لوہے میں جکڑے ہوئے، دہلی میں داخل ہوئے، جہاں ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس دہلی کے بنگلہ کے ایک تہ خانہ میں ہمیں زندہ درگور کر دیا گیا ۔

## دہلی سے انبالہ تک

دوسرے دن ہمیں دہلی سے کرنال اور کرنال سے انبالہ لے گئے ۔ جب انبالہ پہنچے تو رات بھیگ چکی تھی ۔ ہمیں بے آب ودانہ تین علیحدہ علیحدہ پھانسی گھروں میں بند کر دیا گیا، چنانچہ ہم اپریل کے شروع تک یہیں بند رہے ۔

دوسرے دن فجر کے وقت سپرنٹنڈنٹ پارسن، میجر بام فیلڈ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس اور کپتان ٹائی ڈپٹی کمشنر انبالہ یاجوج ماجوج کی طرح میری کوٹھڑی میں آئے اور مجھ سے کہا کہ تم "اس مقدمہ کا سب حال بتا دو، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔" مَیں نے کہا کہ "میں کچھ نہیں جانتا۔" پارسن نے پہلے تو مجھے بہت ڈرایا دھمکایا اور پھر مارنا شروع کیا۔ جب مار انتہا کو پہنچ گئی تو میں گر پڑا ٹائی صاحب اور جام فیلڈ کوٹھڑی سے باہر کھڑے ہو گئے۔ جب اس قدر تشدد پر بھی میں نے کچھ نہ بتایا، تو وہ سب اس دن مایوس ہو کر چلے گئے۔ جب میں نے ظلم و تعدی کی یہ کیفیت دیکھی، تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میرے ذمہ رمضان المبارک کے کچھ روزے باقی تھے، دوسرے دن سے میں نے ان کی قضا رکھنی شروع کر دی۔

دوسرے دن میں روزے سے تھا، علی الصبح پارسن صاحب آیا اور وہی کارروائی شروع کر دی۔ تھوڑی زدوکوب کے بعد مجھے اپنی بگھی میں بٹھا کر ڈپٹی کمشنر ٹائی صاحب کے بنگلے پر لے گیا، جہاں ٹائی اور بام فیلڈ دونوں موجود تھے۔ انہوں نے بڑی چاپلوسی کی اور کہا کہ ہم تحریری عہد کرتے ہیں کہ اگر تم دوسرے شرکاء اور معاونینِ جہاد کے نام بتا دو تو تمہیں سرکاری گواہ بنا کر رہا کر دیں گے اور ایک بڑے عہدے پر بھی فائز کر دیں گے۔ بصورتِ دیگر تمہیں پھانسی کی سزا دی جائے گی۔ مَیں نے اس چاپلوسی پر بھی انکار کر دیا۔

پھر پارسن صاحب ان دونوں سے انگریزی میں کچھ باتیں کر کے، مجھے ایک الگ کمرے میں لے گیا اور وہاں پھر مارنا شروع کیا۔ میں کہاں تک لکھوں آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو لیکن بفضلِ الٰہی میں نے سب کچھ برداشت کر لیا اور ہر دم اپنے رب سے دعا کی "اے ربّ ذوالجلال! یہ امتحان کا وقت ہے، تو مجھے ثابت قدم رہنے کی توفیق عنایت فرما۔" جب وہ ہر طرح مایوس ہو گئے تو لاچار ہو کر انہوں نے آٹھ بجے رات مجھے واپس جیل خانہ میں بھیج دیا۔

میں تمام دن روزے سے تھا، بنگلہ سے باہر نکل کر درخت کے پتوں سے روزہ افطار

کرلیا۔ جیل میں پہنچ کر جو میرے حصّے کا کھانا رکھا ہوا تھا کھایا اور شکر الٰہی بجا کے سو گیا۔

جس دن ٹائی صاحب کے بنگلہ پر مار پیٹ کی لذت اٹھا رہا تھا، اس وقت منشی حمید علی صاحب تھانہ پوری تحصیلدار نرائن گڑھ اپنے عہدہ سے معطل ہو کر باہر برآمدہ میں غمگین بیٹھا تھا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے چند برس پہلے، اپنے کسی دنیاوی معاملہ میں مجھے ایک خط لکھا تھا اور کچہری کے بعض عملہ نے۔ اس سے دشمنی کی بناء پر، اس کے معنی غلط بیان کر دیئے تھے۔ مَیں اس کا غمگین چہرہ دیکھ کر اپنی تکلیف بھول گیا اور دل میں خیال آیا کہ مجھ منحوس اور نالائق کو ایک خط لکھنے کی وجہ سے یہ بے چارہ بے گناہ پکڑا گیا۔ اگر اس کے بجائے مجھے ہی سزا ہو جائے اور یہ رہا ہو جائے تو یہ بہت بہتر ہے۔ مَیں اپنی حالتِ زار کے باوجود اس کے لیے بہت دعائیں کرتا رہا۔ آخر کار اللہ تعالےٰ کے فضل سے وہ ناکردہ گناہ بری ہو کر اپنے عہدہ پر بحال ہو گیا اور اب تک پنجاب میں اوّل درجہ کا عہدے دار ہے۔ اس دن کے بعد پھر کبھی مجھے سرکاری گواہ بننے کی ترغیب نہیں دی گئی۔

جب میری طرف سے قطعی مایوسی ہوگئی تو محمد رفیع اور مولوی محمد تقی کو مخبر بنا کر رہا کر دیا گیا۔ انہیں کے بیان سے بے چارہ محمد شفیع لاہور سے پکڑا گیا تھا جس کا اس مقدمہ سے بہت ہی تھوڑا تعلق تھا۔ پھر انہی کی رہبری میں پارسن پٹنہ گیا تھا، جہاں ایشری پرشاد ملازم پولیس اور مسٹر ٹیلر سابق کمشنر پٹنہ ——— جسے ۱۸۵۷ء میں مولانا احمد اللہ صاحبؒ وغیرہ موحدوں کو بے قصور نظر بند کرنے کے قصور میں برخاست کر دیا گیا تھا ——— اس کے مددگار ہو گئے، ان کی غیبت سے اس نے مولانا یحییٰ علی صاحب، مولانا عبدالرحیم صاحب، الٰہی بخش اور میاں عبدالغفار کو گرفتار کر کے انبالہ بھیج دیا۔

پھر پارسن بنگال گیا، جہاں اس نے جابجا بہت سے لوگوں کو گرفتار کیا، ان میں سے اکثر تو لاکھوں، ہزاروں روپیہ خرچ کر کے رہا ہو گئے اور بہت سے لوگوں کو پھانسی دینے کی دھمکیاں دے کر گواہ بنا لیا گیا۔ صرف ایک قاضی میاں جان ساکن کارکھلی ثابت قدم رہے، جو گرفتار ہو کر انبالہ

آگئے۔ بصیرالدین، علاؤالدین سوداگران دہلی اور دوسرے بہت سے لوگ دہلی سے بھی گرفتار ہوکر آگئے۔ پشاور سے بنگال کے مشرقی و شمالی کنارہ تک شاید کوئی مالدار مسلمان، مولوی یا غازی بچا ہو، جسے ایک دفعہ پولیس نے پکڑ کر، اس کی طاقت کے مطابق اپنی مٹھی گرم نہ کر لی ہو۔ یہ ہنگامہ دار و گیر دسمبر سے اپریل تک جاری رہا اور صدہا آدمیوں کو ڈرا، دھمکا اور سکھلا کر گواہ بنا لیا گیا۔

اس پارسن گردی کے زمانہ میں وہ بے چارہ حسینی تھانیسری بھی دہلی سے اشرفیاں لاتے ہوئے پکڑا گیا اور کل اشرفیاں ضبط کرکے ہمارے ساتھ ہی بے قصور عمر قید ہوا۔

## غداروں پر نوازشیں

ہم نے دیکھا ہے کہ اس مقدمہ میں بڑے بڑے صاحب لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے آئین اور قانون کو طاقِ نسیان کر دیا مثلاً ایشری پرشاد وغیرہ نے اپنے فائدے کے لیے اس مقدمہ کو رسی سے سانپ اور رائی سے پہاڑ بنا دیا اور ہمیں نپولین یا مہدی سوڈانی جیسا انگریزوں کا دشمن ثابت کرکے اپنا مطلب نکالنا چاہا! چنانچہ اسے کامیابی ہوئی اور وہ ایک ادنیٰ عہدے سے ڈپٹی کلکٹر ہو گیا نیز دھوکہ دے کر سرکار سے بڑی بڑی زمینداری اور جاگیر بھی حاصل کر لی۔ اسی طرح غزن خان نے اپنے بیٹے کے قافلہ کے بھیجنے کا ایک جھوٹا اور فرضی قصہ گھڑ کر حکومت سے ایک دو گاؤں جاگیر لے لیے۔

سنہ ۱۸۶۳ء کے اخیر سے لے کر دس برس تک ہندوستان کے مسلمانوں پر قیامت برپا رہی۔ مسلمان خوف کے مارے گھر بار چھوڑ کر عرب ممالک میں ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ خود غرض خوشامدیوں اور ہمارے دشمنوں نے دل کھول کر ارمان پورے کیے۔ دس برس تک اخباروں میں یہی قصہ موضوعِ سخن بنا رہا۔ برسوں تک اس دار و گیر کے لیے ایک باقاعدہ محکمہ موجود رہا جس کا کام ہی یہ تھا کہ جس کو چاہا پکڑ لیا، جو چاہا رشوت لے لی اور جس نے رشوت دینے سے انکار کر دیا، اپنے معمولی گواہوں سے گواہی دلا کر اسے عمر قید کر دیا۔

## شیخ الکل میاں نذیر حسینؒ کی طلبی

چیمبرلین صاحب وہابیوں کی اس دار وگیر کے سلسلہ میں کمشنر مقرر ہوئے تھے اور راولپنڈی ان کا صدر مقام تھا۔ انہوں نے وہابیوں کی حمایت کے جرم میں شیخ الکل حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ کو بھی دہلی سے راولپنڈی طلب کیا۔ ابھی کچھ کارروائی شروع نہ ہوئی تھی کہ احکم الحاکمین اور سریع الانتقام کو اپنے برگزیدہ بندوں پر ظلم کی یہ کارروائی پسند نہ آئی اور اس نے چیمبرلین صاحب کی موت ناگہانی کے وارنٹ جاری کرکے اسے اپنے دربار عالی میں طلب کر لیا۔ اس کی موت کے بعد پھر کسی کو اس خطرناک خدمت کے قبول کرنے کا حوصلہ نہ ہوا، وہ محکمہ ہی ٹوٹ گیا اور غریب مسلمان اس غیبی تائید کے ساتھ اس آفتِ ناگہانی سے محفوظ ہو گئے۔ حضرت میاں صاحب محدث دہلویؒ جنہیں ہندوستان کے تمام اہلِ حدیث ممبروں کے نام ظاہر کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا، رہا ہو کر اپنے گھر تشریف لے گئے۔

## ہمارے ہندوستانی مسلمان

خود غرض لوگوں نے ہماری بہادر اور دانا سرکار کے دل پر، ان سو دو سو فقیروں کا ڈر اور رعب اس قدر جمایا اور اس میں ایسا مبالغہ کیا کہ گویا انگریزی سلطنت کا قلع قمع کرنے والے ہیں لوگ ہیں اور اس کا اثر جس قدر ہماری فاتح قوم پر ہوا ہے، وہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "OUR INDIAN MUSALMANS" کے دیکھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس میں کیسے رسی کا سانپ اور رائی کا پہاڑ بنایا گیا ہے اور کن کن لایعنی دلائل سے فاتح اور مفتوح قوم کے درمیان عداوت ثابت کی گئی ہے اور پھر طرّہ یہ کہ علی العموم ہندوستان کے تمام مسلمانوں پر حملہ کیا گیا ہے حالانکہ اس تحریر کے بعد بڑے بڑے موقعوں پر خیر خواہی و خیر سگالی کے جذبات پیدا ہوئے لہٰذا فاتح اور مفتوح کے دلوں کو بگاڑنے والی یہ کتاب ہرگز قابلِ اعتبار نہیں ہے۔

جب یہ کتاب چھپ کر آئی، اسی وقت مولوی سید احمد صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی نے بڑے دلائل سے اس خیالی پلاؤ ڈاکٹر کی تردید کرکے اس کی دھجیاں اڑا دیں اور

ہر دعویٰ کو اصول ہی سے غلط ثابت کر دکھایا[1] لیکن وہابیوں کو اپنا جانی دشمن سمجھنے والے انگریزوں پر ابھی تک اس کتاب کا جادوانہ اثر باقی ہے۔ اگرچہ افغانوں نے پنجاب میں عملداری کے ابتداہی میں صدہا بڑے بڑے معزز انگریزوں، میم اور بچوں حتیٰ کہ گورنر جنرل تک کو مار ڈالا اب بھی جہاں موقع پاتے ہیں، اپنی وحشیانہ حرکت سے باز نہیں آتے۔ ان کے مولویوں نے بھی فتوے دے رکھا ہے کہ انگریزوں کا مارنا بڑا ثواب ہے لیکن اس کے باوجود انگریز افغانوں کو اپنا اس قدر دشمن نہیں سمجھتے، جتنا کہ وہابیوں کو، ڈاکٹر ہنٹر کے پھیلائے ہوئے تعصب کے باعث انہوں نے اپنا دشمن فرض کر رکھا ہے حالانکہ وہابیوں سے کسی انگریز کا قتل تو کجا، کبھی خلافِ تہذیب بات بھی سرزد نہیں ہوئی۔

۱۸۵۷ء میں جب کہ بغاوت اپنے عروج پر تھی۔ وہابیوں نے انگریزوں کی میم اور بچوں کی حفاظت کی، انہیں اپنے گھر میں چھپایا اور باغیوں سے محفوظ رکھا[2] مگر ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کی وجہ

---

[1] سرسید احمد خان نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "OUR INDIAN MUSALMANS" پر "REVIEW ON DR. HUNTER'S INDIAN MUSALMANS" کے نام سے نہایت تفصیل سے تبصرہ کیا تھا جو کہ مختلف اخبار و رسائل میں شائع ہوا تھا، کئی مرتبہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں اقبال اکیڈمی لاہور کی طرف سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا تھا۔

[2] مولانا تھانیسریؒ کا یہ اشارہ حضرت شیخ الکل مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلویؒ کے اس واقعہ کی طرف ہے کہ آپ نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے موقعہ پر ایک انگریز میم مسز لیس کو پناہ دی تھی۔ اہلِ حدیث اور حضرت میاں صاحبؒ سے عناد رکھنے والے بعض لوگ اس واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے انگریز نوازی کا الزام لگایا کرتے ہیں۔ اس لیے یہاں واقعہ کی اصلیت سے آگاہ کر دینا بےجا نہ ہوگا۔ حضرت میاں صاحبؒ کا اس انگریز عورت کو پناہ دینا آپ کی عظمتِ شان کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ آپ نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے یہی آپ کے شایانِ شان تھا قرآن مجید، احادیثِ نبوی اور فقہ کی رو سے حالتِ جنگ میں کافر قوم کے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں

سے دونوں قوموں کے درمیان تعصب، نفرت اور دشمنی بہت بڑھ گئی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان گزشتہ پچیس برس کے تجربوں اور وہابیوں کی خیر خواہی نے ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی دروغ گوئی کو طشت از بام کر دیا ہے؛ چنانچہ گورنمنٹ ہند کے حکم سے سرکاری تحریرات میں ان کے لیے وہابی کے لفظ کا استعمال یک قلم بند ہو گیا ہے اور آئندہ سے یہ لوگ اپنے پرانے نام محمدی یا اہلِ حدیث سے پکارے جائیں گے۔ گورنمنٹ کا یہ ایک مستحسن اقدام ہے۔ اس وجہ سے اگر کبھی موقع آ پڑے تو سرکار پر اپنی جان نچھاور کرنے سے بھی یہ لوگ دریغ نہ کریں[1]۔

---

کو قتل کرنا ہرگز جائز نہیں بلکہ ارشادِ باری تعالیٰ یہ ہے:- وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ (التوبہ آیت ۶) ترجمہ یہ ہے کہ "اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو تاکہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لیے کہ وہ جانتے نہیں"۔ پس حضرت میاں صاحبؒ نے ایک زخمی انگریز عورت کو صرف اس لیے پناہ دی کہ خدا و رسول کا حکم یہی تھا۔ یہ قرآن مجید کی مذکورہ آیت کے مطابق عمل کرنے کا وقت تھا جو زندگی میں شاید پھر کبھی میسر نہ آتا۔ بلوائیوں کے شہر پر قبضہ کے باعث اگرچہ آپ کو مشکلات کا علم تھا لیکن خدا و رسول کو خوش کرنے کا بھی یہی موقع تھا؛ چنانچہ آپ نے ایک ایک لفظ پر عمل کر دکھایا۔ عورت کو پناہ دی، زخمی تھی اس کا علاج کیا، اللہ کا کلام سنایا اور پھر اسے اس کی قوم میں پہنچا دیا جو کہ اس کا "مامن" تھا۔

[1] یہاں بھی اہل حدیث پر انگریز دوستی کا الزام لگانے والوں کے لیے غلطی میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے (بلکہ بعض لکھے پڑھے دوست غلطی میں مبتلا ہو گئے) اس لیے ان سطور کے پسِ منظر کو بیان کر دینا ضروری ہے۔ مولانا تھانیسریؒ نے سوانح احمدی یا اپنی کتاب "کالا پانی" اس وقت تحریر فرمائی جب انگریز اہلِ حدیث کی مخالفت میں جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا اور تحریکِ جہاد انتہائی مقہور تھی حتیٰ کہ مجاہدین کو دار و رسن اور قید و بند کی ایسی ایسی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا جن کے تصور ہی سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انگریز کی کوشش تھی کہ تحریک کو کچل کر مجاہدین کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے

## مقدمہ انبالہ

دسمبر سے اپریل تک داروگیر کا یہ سلسلہ جاری رہا اور اپریل میں یہ مقدمہ ضلع انبالہ کے مجسٹریٹ کے پاس پیش ہوا۔ ہم سب لوگوں[1] کو پھانسی گھروں سے نکال کر کچہری میں لے جایا گیا۔ کچہری میں جا کر معلوم ہوا کہ پھانسی کی دھمکی دے کر میرے بھائی محمد سعید کو میرے اوپر اور محمد شفیع کے حقیقی بھائی محمد رفیع کو اس پر گواہ بنا لیا گیا ہے نیز پچاس ساٹھ دیگر آدمیوں کو بھی زبردستی گواہ بنا لیا گیا ہے۔ ان بے چاروں کی عجیب حالت تھی ایک طرف گواہی دے رہے تھے اور دوسری طرف ہماری جانب دیکھ کر زار زار رو رہے تھے۔ یہ بے بس اور مجبور محض تھے کیونکہ اگر گواہ نہ بنتے تو تختۂ دار پر لٹکا دیئے جاتے۔ ادائے شہادت تک ان بے گناہوں کو قیدیوں کی طرح پولیس کے زیر حراست رکھا گیا۔ لباس اور خوراک کا انتظام سرکاری تھا جس کی وجہ سے ان بے جا کارروائیوں پر حکومت کا لاکھوں روپیہ صرف ہو گیا۔

---

ایسے نازک ترین لمحات میں مولانا نے اپنی کتابیں لکھیں مبادا کہ برصغیر کی تاریخ اسلام کے اس سب سے زیادہ درخشاں باب کے حالات طاقِ نسیاں کی زینت ہو جائیں۔ مولانا کے لیے عجیب مخمصہ کا عالم تھا اگر آپ حقائق کو من و عن بیان کرتے تو پھر سے قید و بند کی تنہائیاں اور زنجیر و سلاسل کی سختیاں تھیں مگر ان سے تو آپ قطعاً خائف نہ تھے البتہ اس بات کا زبردست امکان تھا کہ حکومت ان کی اشاعت میں زبردست رکاوٹ ڈال دے گی یا تمام مواد ضبط کر لے گی اور یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ اس لیے مولانا مرحوم نے حالات کے ان تقاضوں کے پیشِ نظر جہاں تک ممکن ہوا واقعات میں لچک پیدا کر کے حکومت کی دستبرد سے محفوظ کرنے کی کوشش کی اس سلسلہ میں آپ سے [illegible] بھی ہوئی ہوں تو آپ معذور ہیں تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے "تذکرۂ شہید" ص ۲۱۵ - ۲۱۶ از محمد خالد سیف۔

[1] مولانا محمد جعفر کے علاوہ پٹنہ کے مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم، حسین بن منگھو انبالہ کے شیخ محمد شفیع، عبدالکریم تھانیسر کے حسینی بن محمد بخش اور میاں عبدالغفار، قاضی محمد جان، عبدالغفور اور الٰہی بخش بن کریم بخش انبالہ کے مقدمہ میں ماخوذ تھے۔

## پولیس تشدّد کی ایک مثال

پولیس کے ان بے گناہوں پر مظالم، تشدّد اور زد و کوب کا اندازہ اس سے لگائیے کہ عباس نامی ایک لڑکا، جس نے مدت تک میرے گھر میں رہ کر پرورش پائی تھی، جب مجھے دیکھ کر محبت کے مارے مجسٹریٹ کے پاس جھوٹا اور آموختہ بیان دینے سے ہچکچایا تو اسی روز رات کو اس بچے کو ایسی سخت سزا دی گئی کہ وہ تاب نہ لاتے ہوئے قبل از پیشی مقدمہ سیشن ہی دم توڑ گیا مگر بدنامی کے ڈر سے بچنے کے لیے پارسن نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ اس کی وفات کسی مرض کی وجہ سے ہوئی ہے۔

## بھائی کا جھوٹی گواہی سے انکار

جب ہم پہلے دن مجسٹریٹی میں حاضر کیے گئے، تو میرا بھائی بھی پولیس کے زیر حراست گواہوں میں سے تھا۔ اس نے ایک سپاہی کے ذریعہ مجھے یہ اطلاع دی کہ پولیس نے مار پیٹ کر مجھے تمہارے خلاف گواہ بنایا ہے لہٰذا اب جس وقت بر سر اجلاس بیان ہوں گے تو میں اپنے اس بیان سے پھر جاؤں گا، جسے مار پیٹ کی وجہ سے لکھوایا ہے۔ میں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میری آزادی اور قید خدا کے ہاتھ میں ہے، تمہاری گواہی پر موقوف نہیں۔ اگر تم نے حلفیہ بیان دیا ہے تو پھر جانے کی صورت میں بجرم دروغ حلفی تمہیں سخت سزا ہو گی۔ میں تو پہلے سے پھنسا ہوا ہوں تمہارے پھنس جانے کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ ضعیف والدہ صاحبہ شاید صدمہ کی تاب نہ لا سکیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جو بیان تم نے پہلے لکھایا ہے، اسی پر قائم رہو لیکن بایں ہمہ جب اس کا میرے سامنے بیان ہونے لگا تو وہ پہلے بیان سے منحرف ہو گیا۔ بر سر اجلاس اس کا انکار سن کر صاحب لوگ پہلے تو بڑے برافروختہ ہوئے اور پھر اس کی صغر سنی کی وجہ سے اسے کوئی سزا نہ دے سکے اور اس کا نام گواہوں کی فہرست سے نکال دیا۔

گواہوں کی کثرت کی وجہ سے یہ مقدمہ ایک ہفتہ تک مجسٹریٹ کی کچہری میں پیش ہوتا رہا۔ صاحب لوگوں کا تعصب ہم سے اس حد تک تھا کہ جب مقدمہ کی پیشی کے وقت ہم نے یہ درخواست کی کہ

ہماری نماز کا وقت آگیا ہے لہٰذا ہم کو نماز پڑھنے کی اجازت بخشی جائے لیکن انہوں نے ہمیں یہ اجازت نہ دی مگر وہ ہمارا کیا کر سکتے تھے ہم نے عین دوران مقدمہ میں، تیمم کر کے بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لی۔

**مقدمہ سیشن سپرد**

ایک ہفتہ کی کارروائی کے بعد ہمارا مقدمہ سپرد سیشن ہوا۔ اس وقت تک ہم پھانسی گھروں میں علیحدہ علیحدہ قید تھے۔

سیشن سپردگی کے بعد ہم سب کو حوالات میں ایک جگہ بند کر دیا گیا۔ ایک مدت کی چلہ کشی کے بعد ہم سب دوست ایک جگہ جمع ہوئے تو ہماری مسرت کی انتہا نہ رہی میں تو اکثر سعدیؒ کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا ؎

پائے در زنجیر پیش دوستان
بہ کہ با بیگانگان در بوستان

گر چہار ماہ کی اس تخلیہ اور تنہائی سے بھی ہم لوگوں کو بہت روحانی فائدہ ہوا تھا قلب کے آئینہ صافی میں انوارِ الٰہی خوب محسوس ہوتے تھے۔ نماز روزے میں کمال لذت حاصل ہوتی تھی کہ شاید وہ کیفیت برسوں کی چلہ کشی اور گوشہ نشینی بھی حاصل نہ ہوتی۔

**مولانا یحییٰ علی کی صحبت**

اس وقت محمد شفیع اور عبدالکریم تو کسی قدر کشیدہ خاطر رہا کرتے تھے لیکن مولانا یحییٰ علی صاحبؒ کی صحبت غنیمت

---

[1] حضرت مولانا یحییٰ علی صاحبؒ، مولانا احمد اللہؒ کے برادر اصغر اور حضرت مولانا ولایت علی صادق پوریؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ہمیشہ ان کے ساتھ رہے اور یاغستان کی لڑائیوں میں دستِ راست۔ حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا کاٹتے ہوئے ۲۶ شوال ۱۲۸۴ھ ۲۰ فروری ۱۸۶۸ء کو انڈمان میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ ملاحظہ فرمائیے تذکرہ صادقہ ص ۶۳ - ۷۹ سرگزشت مجاہدین ۳۷۲، ۴۳۲، ۴۳۵ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۰۶ - ۱۰۷، ۱۲۷ - ۱۲۸۔

سے کم نہ تھی۔ اسی طرح ہم باقی نو آدمی بھی اس حوالات میں نہایت شاداں اور فرحاں تھے اور یہ خاکسار تو جب اپنی ذلیل النفسی اور کم علمی کے مقابلے میں ان انعاماتِ الٰہی اور اس سرفرازی کو دیکھتا تو سمجھتا تھا کہ میری مثال تو ٹھیک اسی طرح ہے، جیسے سفارش، استحقاق اور ذاتی لیاقت کے بغیر ہی کسی چمار کے سر پہ تاجِ شاہی رکھ دیا جائے۔ اللہ اللہ! میرا حسب نسب اور لیاقت کہاں اور راہِ خدا کے امتحان میں ثابت قدم رہنے کی یہ سرفرازی کیسی! اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ ایسے امتحانوں میں پیغمبرؑ اور صحابہ کرامؓ بھی گھبرا جاتے تھے۔ اس صبر اور استقلال کو انعامِ خداوندی سمجھنے کی وجہ سے میری زبان تو اول سے آخر تک شکر کے ترانوں سے لبریز رہی۔

مولانا یحییٰ علی صاحب کی کیفیت تو اس سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تھی۔ آپ اکثر ان اشعار کو پڑھا کرتے تھے ؎

فلست ابالی حین اقتل مسلمًا — علی ای شقٍ کان فی اللہ مصرعی

و ذٰلک فی ذات الالٰہ و ان یشأ — یبارک علی اوصال شلو ممزّعٖ

ترجمہ:- "مسلمان ہونے کی حالت میں مجھے جس کروٹ بھی مارا جائے، اس کی قطعاً پرواہ نہیں، کیونکہ مجھے خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور یہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان پراگندہ ٹکڑوں کے ملا دینے پر ان میں برکت فرما دے۔"

مشہور صحابی حضرت خبیبؓ کو جب کفار کو پھانسی دینے لگے، تو آپ نے ان اشعار کو نہایت جوانمردی سے پڑھتے ہوئے، راہِ خدا میں جان دے کر خلعتِ شہادت کی سرفرازی کو حاصل کر لیا تھا اور آپ کی خبرِ شہادت اور سلام شوق کو خود حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک مدینہ منورہ میں پہنچایا تھا۔

مولانا یحییٰ علی صاحب حضرت سید احمد شہیدؒ کے فراق میں یہ شعر بھی بڑے درد اور عشق سے اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

آشنا پیغام درد کا کہنا، جب صبا کوئے یار سے گزرے
کون سی رات آپ آئیں گے، دن بہت انتظار میں گزرے

**مقدمہ کی پیروی**

کچھ عرصہ کے بعد اپریل کے آخر میں یہ مقدمہ باجلاس میجر ایڈورڈز محکمہ سیشن میں پیش ہوا اور ایک ہفتہ تک روبکاری ہوتی رہی۔
محمد شفیع اور عبدالکریم کی طرف سے مسٹر گڈال بیرسٹر محکمہ مجسٹریٹی میں وکیل اور پیروکار تھے۔
جب یہ مقدمہ کچہری سیشن میں پیش ہوا تو مولوی محمد حسن اور مولوی مبارک علی صاحب نے، جو پٹنہ والوں کی طرف سے پیروکار تھے، مسٹر پلاوڈن نامی ایک دوسرے وکیل کو بلایا۔ یہ وکیل بڑا جہاں دیدہ اور فہمیدہ آدمی تھا۔ جب پلوڈن اپنا مختار نامہ لے کر، حوالات میں ہمارے دستخط کرانے آیا، تو مولانا عبدالرحیم صاحب، مولانا یحیٰی علی صاحب، الٰہی بخش سوداگر، حسینی، قاضی میاں جان، عبدالغفار اور منشی عبدالغفور صاحب نے تو اس پر دستخط کر دیئے، مگر میں نے نہ کیے اور کہا کہ میں وکیل ہوں، اپنی جواب دہی آپ کر دوں گا۔
مولانا یحیٰی علی صاحب وکیل کی تقرری اور روپیہ کی بربادی سے راضی نہ تھے بلکہ اگر دوسرے لوگ آپ کو نہ روکتے تو آپ اپنے نیک اعمال کا اقبال کرنے کو تیار تھے لیکن آپ کی طبیعت اس قدر سیدھی سادی اور بے عذر تھی کہ جب آپ سے مختار نامہ پر دستخط کرنے کے لیے کہا گیا تو اس پر دستخط کر دیئے۔
حکومت کی طرف سے میجر ونکفیل اور پا[illegible]ن پیروکار اور وکیل تھے اور دس مدعا علیہم کی طرف سے دو وکیل تھے اور میں بذاتِ خود اپنی جواب دہی کرتا تھا۔ جب کوئی گواہ پیش نہیں ہوتا تو اس کا جواب سیشن جج خود لکھتے اور اس پر جرح کرتے۔ اس کے بعد سرکاری وکلاء پھر مدعا علیہم کے دونوں وکلاء اور آخر میں یہ خاکسار جرح کے سوالات کرتا چونکہ میں سب سے زیادہ اس مقدمہ سے واقف تھا، گواہوں کے حالات اور لیاقت سے بھی بخوبی آگاہ تھا اور فن وکالت میں بھی پورا پورا تجربہ رکھتا تھا اور پھر اس وقت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے

دوسروں کی نسبت مجھے جرح کے ایسے ایسے سوالات سوجھتے کہ اکثر گواہ میرے سوالات کے جواب سے تنگ آکر دوہائی دوہائی کرنے لگتے تھے ۔

اجلاس عام ہونے کی وجہ سے بہت سے یورپین اور ملکی تماشابین حاضر ہوکر یہ تماشا دیکھا کرتے تھے ۔ چار اسیر دو ہندو ، دو مسلمان رؤسا ضلع انبالہ سے بلائے گئے تھے ۔ جب شہادت طرفین تمام ہوگئی تو مدعاعلیہم کے جواب لیے گئے ۔ دس مجرموں کا جواب تو ان کے وکیلوں نے تحریری داخل کیا ۔ آخر میں جب سیشن جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ۔ "بتاؤ تمہارا کیا جواب ہے" ؟ تو میں نے حکومت کے ہر ایک ثبوت کی تردید کرکے اپنا جواب نہایت شرح اور مدلل لکھنا شروع کیا ۔ جج صاحب نے کچھ تو لکھا اور پھر بڑے غصہ سے کہا کہ اس جواب کا کوئی فائدہ نہیں ہے ۔ بہتر یہ ہے کہ تم اپنے قصور کا اقبال کرو اور عدالت سے مہربانی اور رحم کی اپیل کرکے معافی مانگو ۔ میں یہ مخالفانہ تعلیم کا سبق سن کر چپ ہو رہا اور کہا کہ میں فقط انصاف چاہتا ہوں ، جس کی آپ سے کوئی امید نظر نہیں آتی ۔ میں نے اپنی بریت کے لیے دس بارہ گواہ بلانے چاہے لیکن اس کی بھی اجازت نہ ملی بلکہ ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو جب عدالت کا آخری فیصلہ سنایا جانا تھا ، اپنے گواہوں کو خود حاضر کرا دیا لیکن انہیں بھی اظہارِ خیال کا موقع نہ دیا گیا ۔

محمد شفیع اور اکثر دوسرے مدعاعلیہم کی طرف سے بھی بہت سے گواہ پیش ہوئے لیکن بے سود بلکہ محمد شفیع کی طرف سے تو حکومت کی خیرخواہی و خیرسگالی اور عمدہ کارگزاری کے ایک سو سے زیادہ سرٹیفکیٹ پیش ہوئے لیکن اس متعصب جج نے ان سرٹیفکیٹوں کے متعلق یہ لکھا کہ ان کا ایک ایک فقرہ محمد شفیع کے مجرم اور سزائے سخت کے مستحق ہونے پر ایک دلیل ساطع اور برہان قاطع ہے ۔

## مسٹر پلاوڈن کے قانونی نکات

مسٹر پلاوڈن ہمارے لائق اور دیرینہ وکیل تھے ، انہوں نے بہت سی قانونی کتابوں اور نظائر سے ثابت کرکے یہ جواب لکھا تھا کہ ستھانہ وغیرہ ــــــ جہاں یہ جنگ ہوئی ، جس

میں اعانت کا ان لوگوں پر الزام ہے ـــــ سرکار کی عملداری سے باہر ہے۔ لہٰذا یہ جرم دفعہ ۱۲۱ تعزیراتِ ہند کے تحت نہیں آتا۔ دفعہ ۱۲۱ صرف ان اقداماتِ جنگ پر لاگو ہوتی ہے جو سرکاری علاقوں کے اندر عمل میں لائے جائیں۔ ستھانہ اور ملکا بہر حال برطانوی علاقے سے باہر اور آزاد علاقے ہیں۔ سیشن جج ہربرٹ ایڈورڈز نے یہ اعتراض مسترد کر دیا تو پلاؤڈن نے دوسرا اعتراض پیش کر دیا کہ میرے چھ مؤکلوں (مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم، حسینی تھانیسری، حسینی عظیم آبادی، عبدالغفار اور الٰہی بخش) میں سے پانچ کے خلاف مقدمہ اس عدالت میں نہیں چل سکتا کیونکہ انبالہ ڈویژن کی عدالتیں لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے ماتحت ہیں اور میرے پانچ مؤکل عظیم آباد کے رہنے والے ہیں جو گورنر بنگال کے ماتحت ہے۔ ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۲۶ اور ۲۷ کے مطابق جرائم کی تحقیقات یا تو ان اضلاع میں ہونی چاہیئے جہاں ان کا ارتکاب ہوا، یا ان اضلاع میں جہاں ان کے نتائج برآمد ہوئے۔ دفعہ ۲۸ کے ماتحت شرکت اور اعانت کی صورت بھی یہی ہے۔

جب سیشن جج اور دوسرے انگریزوں نے وکیل کی یہ دلیل سنی تو سکتے میں رہ گئے اور سوائے ہاں اور بجا کے ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ لیکن اس مقدمہ میں تو انگریزوں نے تعصب کی انتہا کر دی تھی اور مقدمہ کی کارروائی کے آغاز ہی سے قانون کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ مسٹر پلاؤڈن کے اس قانونی نکتہ کا جواب دینے کے لیے باہم مشورہ کی غرض سے مقدمہ کو چند روز تک ملتوی کر دیا گیا اور گورنر جان لارنس اور دیگر ان افسروں سے مشورہ کیا گیا جو ہمارا قلع قمع ہی چاہتے تھے کیونکہ خود غرض لوگوں نے انہیں یہ سبق پڑھایا ہوا تھا کہ جب ان غریبوں کو پھانسی دے کر نیست و نابود نہ کر دو گے، عملداری سرکار ہند میں رہنا محال ہے۔ ان حالات میں قانون کو کون سنتا ہے؟

**فیصلہ** مدتِ دراز تک التواء کے بعد ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو سیشن جج نے آخری

اجلاس بلایا اور گورنر کے ایماء سے اپنی تجویز اور سزا گھر سے لکھ لایا۔ اجلاس کی ابتداء ہی میں سیشن جج نے پہلے چاروں اسیروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے اس مقدمہ کو اول سے آخر تک سنا، اب آپ کی جو رائے ہو لکھ کر پیش کرو؟ ہم نے دیکھا کہ وہ چاروں اسیر اس وقت بھی ہماری شکلوں کو دیکھ کر آنسو بھر بھر لاتے تھے اور دل سے ہماری رہائی کے خواہاں تھے لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ جج اور کمشنر انہیں سزا دینے پر تلے ہوئے ہیں، تو ڈر کے مارے انہوں نے بھی یہ لکھ دیا کہ ہمارے نزدیک بھی ان پر جرم ثابت ہے۔

اس قانونی حیلہ کے حصول کے بعد جج اور کمشنر نے اپنی اس تجویز کو جو پہلے سے میز پر لکھی ہوئی رکھی تھی، پڑھنا شروع کیا اور آئین بائیں شائیں کر کے مسٹر پلوڈن کی دلیل کو ٹال دیا

**سزا کا فیصلہ**

سب سے پہلے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ تم بہت عقل مند ذی [illegible] قانون دان، اپنے شہر کے نمبر دار اور رئیس ہو۔ تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا۔ تمہارے ذریعہ سے سرکار کے دشمنوں کو آدمی اور روپیہ جاتا تھا۔ تم نے انکار بحث سے کام لیا اور سرکار کی خیر خواہی کا قطعاً دم [illegible] بھرا اور فہمائش کے باوجود تم نے قطعاً سرکار کی خیر خواہی نہ کی لہذا تمہیں پھانسی دی جائے گی، تمہاری کل جائیداد بحق سرکار ضبط ہو گی، تمہاری لاش بھی وارثوں کو نہیں دی جائے گی بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ جیل کے گورستان میں گاڑ دی جائے گی۔ آخر میں یہ بھی کہا کہ میں تمہیں پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔

صاحب موصوف کا یہ سارا بیان میں نے نہایت سکوت سے سُنا اور صرف آخری فقرہ کے جواب میں کہا کہ جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے، آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے لیکن اس جواب باصواب سے وہ بہت خفا ہوا۔ مگر پھانسی کا حکم دینے سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا؟ جس قدر سزائیں اس کے اختیار میں تھیں، دے چکا تھا۔ اس وقت میرے منہ سے یہ الہامی فقرہ نکلا کہ میں تو اس وقت

پہنچے تو ہم سب کو گیروا لباس پہنا دیا گیا۔ ہم تین پھانسی والوں کو تو علیحدہ علیحدہ تین پھانسی گھروں میں بند کر دیا گیا اور باقی آٹھ آدمیوں کو جیل میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ ملا دیا گیا۔

۱۷ مئی کی رات جب ہم جیل کی ان تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں داخل ہوئے تو پہلی رات ہی جہنم کا ایک نمونہ مل گیا۔ صبح ہم نے اہالیان جیل خانہ سے اپنی یہ تکلیف بیان کی اور چاہا کہ رات کو ہمیں ان کوٹھڑیوں سے باہر رکھا جائے مگر جیل خانہ کے سب اہالی ڈر کے مارے انکار کر کے باہر چلے گئے۔ جب یہ انکار کر کے جیل خانہ سے باہر نکلے اسی وقت ایک سوار تار گھر سے ایک ضروری لفافہ لے کر پہنچا۔ کھول کر جو دیکھا تو اس میں یہی لکھا تھا کہ ان تینوں پھانسی والوں کو بوقت شب باہر سلایا کرو۔ تائید الٰہی کا یہ طرفہ تماشا دیکھ کر اسی دم جیل والوں نے ہمیں یہ حکم سنا دیا کہ تمہارے لیے بڑے اہتمام سے تین نئی پھانسیاں اور ان کے ریشمی رستے تیار ہوئے ہیں اور ادھر پھانسی کی منظوری کے لیے مقدمہ کی مسل کو پنجاب کے محکمہ چیف کورٹ میں بھیج دیا گیا۔

## چیف کورٹ میں اپیل

ہمارے دونوں وکیل بھی کچھ زائد محنتانہ لے کر مولانا محمد حسن صاحب، مولانا مبارک علی صاحب برادرم محمد سعید اور عبدالرحمٰن پسر محمد شفیع کے ہمراہ چیف کورٹ میں پہنچے اور میجر ڈکمیل وغیرہ سرکاری وکلاء اور پیروکار بھی سب سے پہلے حاضر ہو گئے تھے اور ادھر جیل میں نقل حکم منگوا کر میں نے بھی خوب مدلل اپیل لکھ کر سپرنٹنڈنٹ جیل کی معرفت چیف کورٹ روانہ کر دی۔

چیف کورٹ کے چند اجلاسوں میں بھی یہ مقدمہ بڑی دھوم دھام سے پیش ہوا اور وہاں بھی ہمارے وکیل مسٹر پلوڈن نے بڑے دلائل سے بار بار یہ کہا کہ یہ لوگ زیر دفعہ ۱۲۱ ہرگز قید نہیں ہو سکتے۔ اس دفعہ کی رو سے انہیں قید کرنا سراسر خلاف قانون ہے، ان پر کوئی دوسری دفعہ قائم کرو۔ اس زمانہ کے جوڈیشنل کمشنر مسٹر رابرٹ کسنٹ نے بھی وکیل کی اس قانونی دلیل کو بر سر اجلاس تسلیم کر لیا لیکن مشورہ کرنے کی غرض سے پھر چند روز تک التوا

پہنچے تو ہم سب کو گیروا لباس پہنا دیا گیا۔ ہم تین پھانسی والوں کو تو علیحدہ علیحدہ تین پھانسی گھروں میں بند کر دیا گیا اور باقی آٹھ آدمیوں کو جیل میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ ملا دیا گیا۔

۱۷ مئی کی رات جب ہم جیل کی ان تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں داخل ہوئے تو پہلی رات ہی جہنم کا ایک نمونہ مل گیا۔ صبح ہم نے اہالیانِ جیل خانہ سے اپنی یہ تکلیف بیان کی اور چاہا کہ رات کو ہمیں ان کوٹھڑیوں سے باہر رکھا جائے مگر جیل خانہ کے سب اہالی ڈر کے مارے انکار کر کے باہر چلے گئے۔ جب یہ انکار کر کے جیل خانہ سے باہر نکلے اسی وقت ایک سوار تار گھر سے ایک ضروری لفافہ لے کر پہنچا۔ کھول کر جو دیکھا تو اس میں یہی لکھا تھا کہ ان تینوں پھانسی والوں کو بوقتِ شب باہر سلایا کرو۔ تائید الٰہی کا یہ طرفہ تماشا دیکھ کر اسی دم جیل والوں نے ہمیں یہ حکم سنا دیا کہ تمہارے لیے بڑے اہتمام سے تین نئی پھانسیاں اور ان کے ریشمی رستے تیار ہوئے ہیں اور ادھر پھانسی کی منظوری کے لیے مقدمہ کی مسل کو پنجاب کے محکمہ چیف کورٹ میں بھیج دیا گیا۔

## چیف کورٹ میں اپیل

ہمارے دونوں وکیل بھی کچھ زائد محنتانہ لے کر مولانا محمد حسن صاحب، مولانا مبارک علی صاحب برادرم محمد سعید اور عبدالرحمٰن پسر محمد شفیع کے ہمراہ چیف کورٹ میں پہنچے اور میجر ذکمیل وغیرہ سرکاری وکلاء اور پیروکار بھی سب سے پہلے حاضر ہو گئے تھے اور ادھر جیل میں نقلِ حکم منگوا کر میں نے بھی خوب مدلل اپیل لکھ کر سپرنٹنڈنٹ جیل کی معرفت چیف کورٹ روانہ کر دی۔

چیف کورٹ کے چند اجلاسوں میں بھی یہ مقدمہ بڑی دھوم دھام سے پیش ہوا اور وہاں بھی ہمارے وکیل مسٹر پلوڈن نے بڑے دلائل سے بار بار یہ کہا کہ یہ لوگ زیرِ دفعہ ۱۲۱ ہرگز قید نہیں ہو سکتے۔ اس دفعہ کی رو سے انہیں قید کرنا سراسر خلافِ قانون ہے، ان پر کوئی دوسری دفعہ قائم کرو۔ اس زمانہ کے جوڈیشنل کمشنر مسٹر رابرٹ کسٹ نے بھی وکیل کی اس قانونی دلیل کو برسرِ اجلاس تسلیم کر لیا لیکن مشورہ کرنے کی غرض سے پھر چند روز تک التوا

کیا گیا۔ اسی اثنا میں اخبارات نے یہ خبر شائع کر دی کہ یہ لوگ رہا ہو چکے ہیں صرف حکم سنانا باقی رہ گیا ہے۔ ہمارے گھر والوں کو تو ہماری رہائی کا اس قدر یقین ہو گیا کہ انہوں نے گھر سے کپڑوں کا ایک نیا جوڑا بھی تیار کر کے بھیج دیا تاکہ رہائی کے دن اسے زیب تن کر کے گھر آؤں لیکن چیف کورٹ کا التوا بہت لمبا ہو گیا۔ ہماری خلافِ قانون قید پر غالباً انگلستان تک سے رائے لی گئی۔

۲ مئی پھانسی کے حکم سنائے جانے کی تاریخ سے لے کر ۱۶ ستمبر تک ہم پھانسی گھروں میں رہے۔ اہالیانِ جیل ہمارے پھانسی دینے کا سامان تیار کر رہے تھے اور ادھر ہم انگریزوں کا تماشہ بن رہے تھے۔ صدہا صاحب لوگ اور میم ہمیں دیکھنے کے لیے روزانہ پھانسی گھروں میں آتے تھے۔ دوسرے پھانسی والے عام قیدیوں کے برعکس جب یہ یورپین زائرین ہمیں نہایت شاداں و فرحاں دیکھتے تو ازراہِ تعجب اکثر ہم سے پوچھتے کہ تمہیں تو بہت جلد پھانسی ہو گی پھر تم اس قدر خوشی کا اظہار کیوں کرتے ہو۔ ہم اس کے جواب میں صرف یہ کہتے تھے کہ ہمارے مذہب میں خدا کی راہ میں، ایسے ظلم سے مارے جانے پر شہادت کا درجہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔

خدا کی شان ملاحظہ فرمایئے کہ ہم پھانسی گھروں میں ہی تھے کہ بقر عید آ گئی۔ ہمیں خیال آیا کہ آج مسلمان قربانی کا گوشت خوب اڑاتے ہوں گے۔ اللہ نے ہمارے لیے پھانسی گھروں میں ہی عید کا سامان مہیا فرما دیا، وہ اس طرح کہ اس خیال کے تھوڑی دیر بعد ہی رات کے وقت پلاؤ، قورمہ اور کباب وغیرہ بقر عید کے سب کھانے ہمارے لیے ان پھانسی گھروں میں غیب سے موجود ہو گئے۔ ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا اور خدا تعالیٰ کا شکر بجا لائے۔

ایک رات ہم تینوں آدمی پھانسی گھر میں ایک جگہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ اس وقت ہمارے سب محافظ باہمی مشورہ کے بعد ہم سے کہنے لگے کہ تم تینوں اس وقت اندھیری رات میں بھاگ جاؤ۔ ہمیں غفلت کے جرم میں کچھ قید وغیرہ کی سزا ہو گی جسے ہم بھگت لیں گے لیکن

تمہاری جانیں تو بچ جائیں گی۔ ہم نے ان کی ہمت اور نیت خیر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ خداوندکریم دونوں جہان میں تمہیں اس نیک نیتی کا اجر دے مگر ہم فرار نہیں ہوں گے۔ جب خدا چھڑا دے گا، خود بخود چھوٹ جائیں گے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ بھائیو! جب اس کی مرضی نہ تھی تو میں علی گڑھ سے پکڑا گیا۔ اب دوبارہ ایسی حرکت نہیں کریں گے ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

## قاضی میاں جان کا انتقال

پھانسی گھروں میں قید ہی تھے کہ قاضی میاں جان صاحب بیمار ہو گئے۔ آپ کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا لیکن اس کے باوجود آپ ہسپتال سے پھانسی گھروں میں ہماری ملاقات کے لیے اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ وفات سے ایک دو روز قبل انہوں نے یہ خواب دیکھا کہ آسمان سے ایک تخت جوہر دار اترا ہے اور ان کو اس پر بٹھا کر آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ گویا خواب کی تعبیر یہ ہوئی کہ وہ تخت جنت الفردوس سے آیا تھا اور انہیں لے گیا۔ یہ بزرگ ہم سب لوگوں سے معمر تھے مگر بایں ہمہ بڑے صابر اور مستقل مزاج تھے۔ خداوندکریم انہیں جنت الفردوس نصیب فرمائے۔ ہمارے ساتھیوں نے تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ پڑھنے کے بعد گورستان جیل میں انہیں سپردِ خاک کرا دیا۔

## آہ! والدہ مرحومہ

انہی ایام کا ذکر ہے کہ تھانیسر میں والدہ ماجدہ کو سانپ نے ڈس لیا اور اس کے زہر سے ان کا انتقال ہو گیا۔ سنا ہے کہ آپ بہت استقلال سے جاں بحق تسلیم ہوئیں۔ لوگوں نے جھاڑ پھونک کرنے والے مشرک لوگوں کو بلا کر ان کی صحت کے لیے کچھ شرکیہ رسومات کرنا چاہا تھا مگر انہوں نے اس کی اجازت نہ دی اور فرمایا کہ مدت ہوئی، شرک و بدعت میرے گھر سے اٹھ گیا ہے۔ اب میں اپنے بیٹے کی غیر حاضری میں اپنے گھر میں شرک نہ ہونے دوں گی، ایسی بے ایمانی کی حیات سے موت افضل ہے

جب ان کے انتقال پُر ملال کی خبر ہمیں پھانسی گھروں میں ملی تو اسی رات مولانا یحیٰ علی صاحب نے مراقبہ میں دیکھا کہ وہ جنت میں بڑی شان و شوکت سے ایک تخت پر بیٹھی ہیں۔ پوچھا آپ کو یہ مرتبہ عالی کس سبب سے ملا؟ انہوں نے فرمایا کہ میرے بیٹے کے آلام و مصائب پر صبر کرنے کے باعث، میرے رب نے بخش دیا اور مجھے یہ درجہ عنایت فرمایا۔ اس وقت کی وفات بھی ایک امتحان پر امتحان تھا کہ جان، مال، آبرو اور ہر چیز کی پوری پوری آزمائش کی جائے۔

## کالے پانی کی سزا

مستحق دار کو حکمِ نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی!

محمد علی جوہر

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب ہم پھانسی گھروں میں قید تھے، انہی دنوں ایک مقبول بارگاہِ الٰہی پر اللہ رب العزت نے یہ منکشف فرما دیا تھا کہ ہمیں پھانسی نہیں ہوگی بلکہ کالے پانی کو جانا ہوگا اور میں پھر وہاں سے باعزت زندہ سلامت آؤں گا؛ چنانچہ اس پیش گوئی کے دو ماہ بعد ہماری پھانسی کا حکم موقوف ہوا لیکن ہمیں پیش گوئی سنتے ہی پورا یقین ہوگیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسی وقت اپنے بھائی اور بعض دوستوں کو یہ خوشخبری لکھ دی تھی۔ اس وقت چونکہ تمام انگریزی سلطنت باتفاق ہمارے پھانسی دینے پر مستعد تھی اس وجہ سے شاید دوسرے لوگوں کو اس پیش گوئی کا یقین نہ ہوا ہو خصوصاً جب کہ صورتِ حال یہ تھی کہ اگر کوئی شخص ہمارے حق میں ذرا بھی کلمہ خیر کہتا تو قید ہو جاتا تھا۔ ہمارے شہر کے بیسیوں آدمی صرف اس قسم کے قصور میں قید ہو گئے کہ ان میں سے کسی کے پاس سے میرا کچھ مال و اسباب ملا یا میرے مکانات کی ضبطی و نیلام کے بعد کسی نے اپنے گھر میں میرے بال بچوں کو جگہ دی۔ اس وقت اگر شاہ روم بھی انگریزوں سے میری سفارش کرتا تو کبھی منظور نہ کرتے، ان حالات میں پھانسی کی موقوفی غیر ممکن اور بالکل بعید از قیاس تھی۔

اب اس مقلب القلوب کی ظاہری کارروائی سنیئے کہ جب بہت سے صاحب اور ہم ہمیں پھانسی گھروں میں نہایت شاداں و فرحاں دیکھ گئے تو سب لوگوں میں یہ چرچا پھیل گیا۔ ہمارے جانی دشمن انگریزوں نے یہ خیال کیا کہ ایسے دشمنوں کو منہ مانگی موت تو نہیں دینی چاہیئے کہ جس پر وہ اس قدر مسرت کا اظہار کر رہے ہیں بلکہ انہیں کالے پانی بھیج کر وہاں کے آلام و مصائب کا تختۂ مشق بنانا چاہیئے۔

ہماری پیش گوئی کے مطابق ۱۶ ستمبر کو ڈپٹی کمشنر انبالہ پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور چیف کورٹ کا حکم پڑھ کر سنایا کہ تم لوگ پھانسی کی سزا کو بہت محبوب سمجھتے ہو اور اسے شہادت تصور کرتے ہو اس لیے حکومت تمہیں تمہاری پسندیدہ سزا دینے کے لیے تیار نہیں لہٰذا تمہاری پھانسی کی یہ سزا حبسِ دوام بعبور دریائے شور سے بدلی جاتی ہے۔

اس حکم کے سنانے کے ساتھ ہی ہمیں پھانسی گھروں سے دوسرے قیدیوں کے ساتھ عام بارکوں میں ملا دیا اور جیل خانہ کے دستور کے مطابق قینچی سے ہماری داڑھی، مونچھ اور سر کے بال وغیرہ تراش کر ایک منڈی بھیڑ کی طرح بنا دیا۔ میں نے اس وقت دیکھا کہ مولانا یحییٰ علی صاحب اپنی داڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اٹھا کر کہتے تھے:۔

"افسوس نہ کر، تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کے واسطے کتری گئی۔"

**لطیفہ** قدرت الٰہی کا ایک اور تماشہ بھی قابل ذکر ہے کہ میرے بھاری مجرم ہونے کی وجہ سے میرے لیے ریشمی رسّہ اور پھانسی کا تختہ خاص طور پر نہایت مضبوط تیار کرایا گیا تھا مگر خدا کے حکم سے میری پھانسی تو موقوف ہوگئی اور اسی اثناء میں خاص ولایت کے انگلشمین ایک گورے کو قتل کے جرم کی پاداش میں پھانسی کا حکم ملا اور پھانسی کا وہ سب سامان جو میرے لیے تیار کیا گیا تھا اس بےچارے ہم قوم یورپین کو نصیب ہوا۔ ؎

چاہ کن را چاہ در پیش

جو رسہ میرے گلے میں ڈالنے کے لیے انگریزوں نے بڑے اہتمام سے تیار کیا تھا اس قادر مطلق مقلب القلوب نے ان کے ایک بھائی کے گلے میں ڈلوا دیا اور مجھے صاف صاف بچا لیا۔ اس عجیب وغریب واقعہ کو لوگ اسرار و آیاتِ الٰہی سے تصور کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اس گورے کی پھانسی کے بعد لوگوں نے اس رسّے کے ٹکڑے بھی تبرکاً تقسیم کر لیے تھے۔

## ......جیل کی مشقت بھی

پھانسی کی موقوفی کے حکم سنانے کے بعد دوسرے روز دیگر قیدیوں کے ساتھ ہمیں بھی مشقت کے لیے بھیجا گیا۔ نبی بخش داروغہ جیل، رحیم بخش نائب داروغہ اور دوسرے سب دیسی افسر گو ہمارے عنایت فرما تھے لیکن سپرنٹنڈنٹ جیل کے خوف کی وجہ سے ہم تینوں آدمیوں کو کاغذ کوٹنے کی ڈھینکلی کے کام میں لگا دیا جو اس جیل میں سب سے زیادہ سخت کام تھا۔ تھوڑی دیر تک ہم نے اس کو پاؤں سے ہلایا تو پاؤں شل ہو گئے مگر اسی وقت ڈاکر ڈبٹین عرف ریلو سپرنٹنڈنٹ، جیل کے کاغذ گھر میں آئے اور ہمیں ڈھینکلی کے سخت کام میں دیکھا تو داروغہ پر بہت خفا ہوئے اور ہمیں اس سخت کام سے نکال کر محمد شفیع اور مولانا یحییٰ علی صاحب کو تو سوت کھولنے کے کام میں لگا دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک ناؤ کے پاس لے گئے، جس میں کاغذ پھاڑ کر بھگوئے جاتے تھے اور مجھے کہا کہ یہ دفتر کی ردّی ہے غالباً تمہارے ہاتھ کے لکھے ہوئے کاغذ بھی اس میں ضرور ہوں گے۔ تم اپنا دل بہلانے کے لیے ان کاغذات کو پڑھتے بھی رہو اور ردّی کو پھاڑ پھاڑ کر اس ناؤ میں ڈالتے بھی جاؤ۔ اللہ کے فضل سے میری مشقت دل لگی اور تفریح طبع سے خالی نہ تھی اور دوسرے ساتھی بھی کسی سخت کام میں نہ تھے۔ ہم دن بھر کام کرنے کے بعد رات کو سب کے سب ایک جگہ بارک میں جا کر سو رہتے۔

جب ہم جیل گئے تو قیدیوں کو صرف روٹی، دال اور ہفتے میں دو یا تین دن تیل [illegible] ہوئی ترکاری ملا کرتی تھی۔ گھی، گوشت یا دودھ دہی ابتدائے عملداری سرکار سے کبھی کسی قیدی نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ تائید الٰہی ہمارے شاملِ حال ہوئی کہ جوں ہی ہم جیل میں داخل ہوئے،

انسپکٹر جنرل مجلس پنجاب کے حکم سے پنجاب کے تمام قیدیوں کو عمدہ گوشت، گھی اور دہی ملنے لگی۔ ان غیر مترقبہ نعمتوں کو دیکھ کر سب قیدی ہمیں دعائیں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ سب تمہارے وجود مسعود کی برکت کا نتیجہ ہے۔ طرفہ یہ کہ جب تک ہم لوگ جیل ہائے پنجاب میں رہے، تب تک یہ چیزیں سب جیل خانوں میں برابر ملتی رہیں مگر ہمارے کالے پانی کو روانہ ہونے کے ساتھ ہی یک قلم بلند ہو گئیں بلکہ ہمارے جانے کے بعد بے چارے قیدیوں کو گندم کی روٹی کے بجائے جوار باجرے کی روٹیاں ملنے لگیں۔

## بیماری

ہم انبالہ جیل ہی میں تھے کہ قیدیوں میں وبائی بخار اور سرسام بڑے زور شور سے پھیلا۔ کوئی چوتھے حصہ کے قریب قیدی اس مرض سے فوت ہو گئے۔ کیفیت یہ تھی کہ بخار ہو جاتا اور کچھ دیر بعد مریض چل بستا۔ مہینے دو مہینے کی میعاد والے بہت سے قیدی مر گئے۔ جیل کے باہر خیمے لگائے گئے اور قیدیوں کو ان میں منتقل کر دیا گیا مگر حضرت بخار نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔

خاکسار بھی اس وبائی مرض سے نہ بچا اور سخت بیمار ہو گیا۔ مجھے جیل کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا اور ڈاکٹر بٹسن صاحب دلی توجہ سے میرا علاج کرنے لگے لیکن بخار سے قطعاً آفاقہ نہ ہوا گو سرسام کی نوبت نہ پہنچی تھی مگر میں کئی دن تک بے ہوش پڑا رہا اور کھانے پینے کی کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ انگریزی دوائیں مجھ پر ذرہ بھر اثر نہیں کر رہی تھیں۔ لاچار ہو کر ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اس مرض کے لیے تم گھر پر کیا دوا کھاتے تھے؟ میں نے کہا ہندوستانی دوائیں کھاتا تھا، انگریزی دوائی کبھی استعمال نہیں کی شاید یہی وجہ ہے کہ ان دواؤں سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا تمہیں ان دواؤں کے نام معلوم ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے کہا اچھا ان دواؤں کے نام ایک کاغذ پر لکھ دو ہم تمہیں بازار سے منگوا دیں گے۔ میں نے مربہ سیب، مربہ بہی، شربت انار، شربت بنفشہ، شربت نیلوفر اور ورق نقرہ وغیرہ عمدہ عمدہ مزے دار و مفرح ادویہ ایک کاغذ پر لکھ دیں۔

انہوں نے اسی وقت وہ سب بازار سے منگوا کر میرے حوالہ کر دیں۔

بیماری کی وجہ سے زبان کا مزہ تو بگڑا ہوا ہی تھا، میں نے ان کو جب یکے بعد دیگرے کھایا تو بہت مزا آیا۔ بخار چونکہ تپ محرقہ کی قسم سے تھا، اس لیے شربتوں کے استعمال سے دوسرے دن ہی اتر گیا۔ مربہ جات اور اوراقِ نقرہ کے استعمال سے بدن اور معدہ میں بھی قوت پیدا ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے جب دوسرے دن مجھے تندرست دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور نقاہت دور کرنے کے لیے شوربا گوشت اور دودھ مقرر کر دیا۔

دنیا کی دولت اور حشم و جاہ کی ناپائیداری، حالت سیمابی اور ہرجائی کا اندازہ لگائیے کہ خانہ تلاشی سے قبل ۱۱ر دسمبر تک میرے پاس ہزاروں روپیہ کی جائیداد منقولہ تھی، بیسیوں آدمی میری رعیت میں تھے، ایک بڑے شہر کا نمبردار تھا، گھوڑے اور گاڑیاں سواری کے لیے تھیں اور ہر کام کے لیے گھر میں نوکر چاکر تھے لیکن خانہ تلاشی کے چند گھنٹے بعد جب میں فرار ہوا تو سب جاہ و حشم خاک میں مل گیا۔ میرے فرار یا شدید غصہ کی وجہ سے مقدمہ کے اختتام پر صادر ہونے والے حکم سے قبل ہی انگریزوں نے پہلے دن تمام جائیداد قرق کر لی تھی۔ دوسرے دن میرے عزیزوں کو کوئی اپنے برآمدہ میں بھی کھڑا نہ ہونے دیتا تھا الغرض ایک ہی رات میں کایا پلٹ گئی۔ کل جس مال و دولت کا میں مالک تھا، آج وہ دوسروں کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔

میرے وارثوں کو اس قدر موقعہ بھی نہ ملا کہ وہ قرقی سے قبل جائیداد کا کوئی حصہ علیحدہ کر سکیں ضبطی کا حکم صادر ہونے کے بعد، میرے بھائی نے جب اپنے حصے کا دعوےٰ کیا، تو اسے صرف ایک کوٹھڑی دی گئی اور باقی سب منقولہ وغیر منقولہ جائیداد بحق سرکار ضبط کر کے نیلام کر دی گئی۔ میں نے دور اندیشی خیال کرتے ہوئے، اس حادثہ سے سات برس قبل اپنے حصہ کی کل جائیداد کو اپنی بیوی کے مہر میں مکفول کر کے ایک شرعی بیع نامہ لکھ دیا تھا، اب وہ بیع نامہ بھی پیش کیا گیا مگر انگریزوں کو اس قدر شدید غصہ اور تعصب تھا کہ

انہوں نے ایک منشی اور میری بیوی اور دو شیر خوار بچوں کے ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا۔

پھانسی کے حکم کی تبدیلی کے بعد ہم ستمبر ۱۸۶۴ء سے فروری ۱۸۶۵ء تک انبالہ جیل رہے۔ محمد شفیع کے گھر سے اکثر عمدہ عمدہ کھانا آیا کرتا تھا۔ ہم اسے جیل میں ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر بڑے مزے سے کھایا کرتے اور شکرِ الٰہی بجالایا کرتے تھے۔

یہاں تک اپنی تعریف لکھتے لکھتے میرا نفس بہت پھول گیا ہے اور اکثر مقامات پر اپنی تعریف میں مبالغہ کرنا چاہتا ہے لہٰذا اپنے نفس کے دو عیب بھی یہاں تحریر کرتا ہوں تاکہ اس خود پسند موذی کو ذرا ذلت ہو اور پھر مجھے مبالغہ کی ترغیب نہ دے۔

## صاف صاف باتیں

ان دو عیوب میں سے ایک تو یہ ہے کہ جب ہم ایک مقفل بارک میں سویا کرتے تھے۔ ان دنوں کی بات ہے کہ ایک سپاہی محمد شفیع کے گھر سے پلاؤ لے کر آیا، تو ایک جنگلے کی طرف سے پلاؤ لینے کے لیے چلا گیا۔ پلاؤ دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک بڑی سی بوٹی اٹھا کر منہ میں ڈال لی اور تھوڑا سا چبا کر اسے جھٹ پٹ نگل لینا چاہا، لیکن مالِ مسروقہ حلق سے نیچے کیسے اترتا؟ بوٹی حلق میں پھنس گئی، نیچے جاتی تھی نہ اوپر آتی تھی، میرا دم گھٹنے لگا اور میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ میرا گلا ملا گیا تو وہ بوٹی باہر نکل آئی اور میرے نفس کا یہ عیب سب ساتھیوں کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ اگرچہ محمد شفیع کے ساتھ معاملہ ٹھیک تھا اور ان کی طرف سے ہمیں ہر طرح کی اجازت تھی لیکن پھر بھی یہ حرکت طفلانہ اور نہایت نازیبا تھی لہٰذا میں نے مالِ مشتبہ کے حلق سے نیچے نہ اترنے پر شکر الٰہی ادا کیا۔

اس سے بھی بڑھ کر اپنے نفس کی شرارت کا ایک اور واقعہ عرض کرتا ہوں۔ ہمارے جیل کے ایک ساتھی منشی عبدالغفور خاں بھی تھے جو کہ ہمارے ساتھ انبالہ جیل میں تھے۔ میرے بھائی کے نام ان کے گھر سے دس روپے کا منی آرڈر آیا۔ بھائی صاحب دس روپے کا نوٹ لے کر جب میرے پاس آئے تو انہیں بھی رقم کی شدید ضرورت تھی۔ میں نے منشی عبدالغفور خاں کو اطلاع کیے بغیر وہ نوٹ اپنے بھائی کو دے دیا اور انہوں نے اپنے کام میں اسے خرچ کر لیا

منشی عبدالغفور خاں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے میری کوئی شکایت نہ کی کیونکہ وہ برسوں میرے گھر رہے تھے۔ اور مجھے اپنا بزرگ سمجھتے تھے اور میں نے جرأت بھی اسی بھروسے پر کی تھی تاہم دوسرے لوگوں نے مجھے ضرور لعن طعن کیا۔ اس وقت میرے پاس اتنی گنجائش بھی نہ تھی کہ انہیں دس روپے دے سکتا۔ پورٹ بلیر پہنچنے کے بعد میرے ہاتھ میں روپیہ آیا تو میں نے انہیں لاہور جیل میں بھیج دیا۔

اپنے نفس کے ان دو عیوب کے اظہار کے بعد میں اللہ رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے معاف فرما دے اور میدانِ حشر میں نیکوں کے سامنے ذلیل نہ کرے۔

## مولانا احمد اللہ کی گرفتاری

جن دنوں ہم نے چیف کورٹ پنجاب میں اپیل دائر کر رکھی تھی، ہمارے وکیل مسٹر پلوڈن نے یہ خبر دی کہ اگر تم اپیل کر کے چیف کورٹ پنجاب سے رہا نہ ہوئے تو انگریزوں کا ارادہ ہے کہ وہ مولانا احمد اللہ صاحب[1] کو بھی گرفتار کر لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب ہماری اپیل مسترد کر دی گئی تو انگریزوں نے سکھلا پڑھا کر ہمیں مولانا احمد اللہ کے خلاف جھوٹے گواہ بنانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

تحصیلدار میر مجیب الدین ساکن نارنول، جو رشوت ستانی کے قصور میں انبالہ جیل میں

---

[1] مولانا احمد اللہؒ بن مولانا الٰہی بخش کی ۱۲۲۳ھ / ۹-۱۸۰۸ء میں ولادت باسعادت ہوئی۔ آپ کا اسم گرامی احمد بخش تھا جسے حضرت سید احمد شہیدؒ نے احمد اللہ سے بدل دیا تھا۔ مولانا ولایت علیؒ اور مولانا منور علی آرویؒ سے کسب فیض کیا۔ آپ کی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد انگریز بہادر نے ضبط کر کے کوڑیوں کے مول نیلام کر دی تھی، اہل و عیال کو عین عید کے دن بے خانماں کر دیا گیا تھا۔ اسی داستانِ خونچکاں کو آپ کے صاحبزادے مولانا حکیم عبدالحمیدؒ (۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) نے مثنوی "شہر آشوب" کے نام سے نظم کیا تھا۔ مولانا احمد اللہ صاحبؒ کو بھی حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی تھی۔

دیتا تھا، انگریزوں نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر تم ان گیارہ آدمیوں میں سے کسی کو مولانا احمد اللہ کے خلاف گواہ بنا دو تو تمہارا قصور معاف کر کے تمہیں دوبارہ تحصیلدار بنا دیا جائے گا! چنانچہ اس نے اپنی دنیوی بھلائی کے لیے کارروائی شروع کر دی۔ ہمیں جب اس کا علم ہوا تو ہم نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ بھائیو! "ہماری دنیا تو خراب ہو گئی ہے اب فقط دین باقی رہ گیا ہے۔ خدا را جھوٹے گواہ بن کر اسے نہ بگاڑو۔ کہیں ہماری مثال بھی وہ نہ ہو جائے کہ ؎

دونوں طرف سے گئے پانڈے، اِدھر حلوانہ اُدھر مانڈے

اس کی دن بھر کی ترغیب سے جس قدر اثر ہوتا وہ ہماری تھوڑی سی نصیحت سے زائل ہو جاتا تھا۔ اس لیے اس نے انگریزوں سے کہہ دیا کہ جب تک اس جیل میں محمد جعفر اور مولانا یحییٰ علی صاحب موجود ہیں، کوئی گواہ نہیں بن سکتا! چنانچہ مجھے مولانا صاحب اور میاں عبدالغفار کو سنٹرل جیل لاہور روانہ کر دیا گیا اور محمد شفیع، عبدالکریم، الٰہی بخش اور منشی عبدالغفور وغیرہ کو انبالہ جیل ہی میں رہنے دیا۔ ہمارا اس جیل سے روانہ ہونا ہی تھا کہ محمد شفیع اور عبدالکریم وغیرہ سرکاری گواہ بن گئے اور ان کی جھوٹی شہادت کی وجہ سے وقت کے ولی اللہ، شمس الاسلام حضرت مولانا احمد اللہ صاحب کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی اور مئی ۱۸۶۵ء میں انہیں حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی؛ چنانچہ آپ جون میں ہم سے بھی پہلے انڈمان تشریف لے گئے[1]۔

یہاں یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ پہلے محمد شفیع کو کس قدر شدید غصہ کے ساتھ پھانسی کا حکم دے کر اس کی پچاس لاکھ کی جائیداد ضبط کی اور پھر صرف ایک برس بعد گواہی کا حیلہ کر کے اسے رہا کر دیا تاکہ ضبط شدہ جائیداد واپس نہ دینی پڑے۔ اگر وہ بے چارہ بے قصور تھا جیسا کہ ایک

---

[1] آپ نے بھی مسلسل اٹھارہ برس جزائر انڈمان میں غریبی و اسیری میں گزارے۔ ملاحظہ فرمائیے تذکرہ صادقہ ص ۴۴، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۰۷، ۱۴۰، ۱۵۱، سرگزشت مجاہدین ۳۲۲، ۴۳۲، ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۷۵ - ۲۸۰ لے آپ نے ۱۵ جون ۱۸۶۵ء / ۱۲۸۱ھ کو انڈمان میں قدم رنجہ فرمایا۔

سال بعد کی رہائی سے معلوم ہوتا ہے ، تو بڑے شد و مد کے ساتھ اس کی جائیداد کی ضبطی اور پھانسی کی سزا کیوں تھی ؟ اور اگر وہ بہت بڑا مجرم تھا ، جیسا کہ سیشن جج نے اپنے فیصلہ میں مندرج دلائل سے ثابت کیا تو ایک سال کے بعد رہائی کیوں ؟

اس کے بعد ۱۸۷۱ء تک امیرخاں صاحب سوداگر چرم ، مولوی تبارک علی صاحب ، مولوی امیرالدین صاحب ساکن پٹنہ ، بنگال اور ابراہیم منڈل ساکن اسلام پور وغیرہ وہابیوں کی گرفتاری کے جس قدر مقدمات پیش ہوئے ، ان سب میں ان سرکاری گواہوں کو جھوٹی گواہی دینے کے لیے بلایا جاتا تھا اور میں نے خود ان گواہوں میں سے ایک کی زبانی سنا تھا کہ جب کبھی ہم جھوٹی گواہی دینے سے انکار کرتے ہیں تو ہمیں کہا جاتا ہے کہ تمہیں تو مشروط طور پر صرف اسی لیے رہا کیا گیا تھا کہ تم بوقتِ ضرورت گواہی دے سکو ۔ یاد رکھو اگر تم نے گواہی دینے سے انکار کیا تو تمہیں پہلے وارنٹ پر ہی حبسِ دوام کی سزا دے کر کالا پانی بھیج دیا جائے گا ۔

## اہل و عیال سے ملاقات

انبالہ جیل سے لاہور جانے کے لیے جب میں تیار ہوا ، تو بیوی بچے ملاقات کے لیے جیل میں آئے ۔ جس دن ملاقات ہوئی رمضان المبارک کا مہینہ اور میں روزے سے تھا ۔ جیل سے باہر ایک کوٹھڑی میں بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی ۔ میرا گیرو رنگ کا لباس ، کمبل کا کرتہ اور پاؤں پا بندِ زنجیر و سلاسل دیکھ کر میرے یہ اقربا نہایت غمگین و افسردہ ہوئے ۔ میں نے انہیں تسلی دی اور ہر حال میں دامنِ ایمان و صبر ، مضبوطی سے تھامے رکھنے کی تلقین کی ۔ کوئی سال سوا سال کے بعد آج جب میں نے اپنے بیٹے محمد صادق کو دیکھا ، تو وہ ایسا صحت مند تھا کہ میں اسے مشکل سے پہچان سکا ۔ اس سے یہ میری آخری ملاقات تھی ۔ اس کے بعد میں نے اسے دوبارہ اس دنیا میں نہیں دیکھا ۔

## لاہور جیل کی طرف روانگی

۲۲ فروری ۱۸۶۵ء کو ہم لاہور جیل کی طرف روانہ ہوئے جوگیانہ گیروا لباس زیبِ تن ، کالا کمبل اوڑھے ہوئے بیڑی و ہتھکڑی کے زیور سے آراستہ و پیراستہ منزل در منزل اور کوچ در کوچ یہ قافلہ عشاق

سوئے منزل رواں دواں تھا۔ چالیس چالیس قیدیوں پر مشتمل یہ قافلہ تھا۔ ایک دو گاڑیاں بھی ساتھ تھیں۔ سب پیدل چل رہے تھے البتہ کوئی تھک جاتا تو اسے گاڑی پر سوار کر لیا جاتا ورنہ سب کے سب پاپیادہ خلخال چھن چھناتے بعجب شانِ بے نیازی سے بڑھے جاتے تھے۔ برس سوا برس کے بعد جو باہر کی ہوا کھائی تو طبیعت نہایت خوش ہوئی، راستے میں جو چاہتے خرید کر کھاتے جاتے تھے۔ سفر میں سب سے بڑی نعمت مولانا یحییٰ علی صاحب کی مصاحبت تھی، جس کے باعث سفر میں بھی دن عید اور رات شب برات ہو گئی تھی۔

قدرت کی کرشمہ سازیاں ملاحظہ فرمائیے کہ جس دن ہم نیا گیروا لباس پہن کر منزلِ اوّل سے روانہ ہوئے، مہاراجہ مہندر والی پٹیالہ کی برات اسی راستہ سے عین ہمارے سامنے سے گزرتے ہوئے، بڑی دھوم دھام کے ساتھ جنوب سے شمال کو جا رہی تھی، سورج طلوع ہو رہا تھا، صبح کا سہانا وقت تھا اور فروری کے آخر کے گلابی جاڑے تھے۔ ایک طرف سورج کی کرنوں میں برات کے سونا چاندی، تاشش بادلہ اور ہیرہ مرصع کی چمک، دوسری طرف ہماری لوہے کی بیڑی اور ہتھکڑی کی دمک، اُدھر دوشالوں اور کمخواب و بانات کا رنگ، اِدھر ہمارے جوگیانہ لباس کی سُرخی اور سیاہی کا ڈھنگ، اُدھر ہاتھی اور گھوڑوں کی ہنکار، ادھر ہماری بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی جھنکار ایک دوسرے کے مقابل، اس دنیا فانی کی عزت و ذلت اور مدارج کی کمی بیشی کا فرق عجب خوبی سے دکھلا رہی تھی۔ ممکن ہے اس وقت اس راجہ نے ہمیں بڑی چشم حقارت سے دیکھا ہو لیکن میری ہندوستان واپسی سے بہت برس قبل وہ راہیِ ملکِ بقا ہو گیا ...... کی طرف امیر و فقیر دونوں اسی طرح خالی ہاتھ جاتے تھے، جس طرح اس دارِ فنا میں خالی ہاتھ آتے ہیں۔ افسوس کہ اُس راجہ نے اس عروسِ دنیا سے بہت ہی کم فائدہ اٹھایا، جس کے لیے اس قدر دھوم دھام کا مظاہرہ کیا تھا۔

ہم جو ایک مدتِ دراز کے بعد جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں سے نکل کر باہر کھلی فضا میں پہنچے، تو ہمیں بھی مہاراجہ پٹیالہ کے براتیوں سے کم خوشی نہ ہوئی ہوگی۔ ہم ہرنوں کی طرح چوکڑیاں

بھرتے چلے جارہے تھے۔ جن قیدیوں کے پاس کچھ نقدی تھی، وہ راستے میں جو چاہتے خرید کر کھاتے اور خوشی مناتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ ہم لدھیانہ، پھلور، جالندھر اور امرتسر ہوتے ہوئے لاہور پہنچ گئے۔ آخری منزل لاہور تھی۔ جب شالامار باغ کے سامنے پہنچے تو ہر ایک نے اپنا اپنا من بھر کر جو چاہا سو کھایا کیونکہ جیل کی کال کوٹھڑیوں میں معمولی کھانے کے علاوہ اور چیزیں ملنی محال بلکہ جرم تھیں۔

تین بجے شام کے قریب ہم سینٹرل جیل لاہور کے دروازے پر پہنچے۔ دروازہ پر ہمارے چالان کے تمام قیدیوں کو ایک قطار میں بٹھا دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے ایک کشمیری ہندو داروغہ آیا جس نے ہم سب کو بغور دیکھا اور کسی قدر افسوس بھی کیا۔ پھر ڈاکٹر گرے سپرنٹنڈنٹ جیل آئے۔ اس نے بھی سب سے پہلے ہمارا ملاحظہ کیا اور پھر بڑے غصے سے حکم دیا کہ ان کے پاؤں میں ایک آڑا ڈنڈا بھی ڈال دینا چاہیئے؛ چنانچہ اس حکم کے صادر ہونے کے ساتھ ہی لوہار آہنی ڈنڈے لے کر حاضر ہو گئے اور ہمارے دونوں پاؤں کے دونوں کڑوں کے درمیان ایک فٹ پانچ گرہ لمبا آڑا ڈنڈا ڈال دیا گیا۔ ازراہِ تعصب یہ ڈنڈا صرف ہمارے لیے ہی تھا ورنہ جیل میں ہم نے اور کسی قیدی کے پاؤں میں نہیں دیکھا۔ اس ڈنڈے کی وجہ سے چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہو گیا اور رات کو پاؤں پسار کر سونا بھی نہایت محال تھا۔

## سینٹرل جیل لاہور

اس جیل کے درمیان میں ایک برج تھا اور اس کے ارد گرد آٹھ علیحدہ علیحدہ بارکیں، صحن اور کارخانہ مشقت بنا ہوا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے حکم دیا کہ اس مقدمہ میں ملوث تمام قیدیوں کو علیحدہ علیحدہ [illegible] نمبروں میں رکھو تاکہ یہ ایک دوسرے سے ملنے نہ پائیں۔ اس دن دوستوں سے جدا ہونے کی اذیت آہنی ڈنڈے سے بھی بڑھ کر محسوس ہوئی۔ مجھے ان بارکوں میں سب سے زیادہ سخت نمبر اول میں لے گئے لیکن تائیدِ غیبی سے ۶ بجے شام یہ حکم پہنچا کہ یہ قیدی انبالہ کے بیماری والے جیل سے آئے ہیں لہٰذا انہیں دوسرے قیدیوں سے علیحدہ رکھا جائے، تاکہ بیماری اس

جیل میں نہ پھیلیے۔

اس حکم کے بعد بارک نمبر ایک کو، جہاں مجھے رکھا گیا تھا، میرے تمام ساتھیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ ہم سب دوستوں کے اس اجتماع پر بہت خوش ہوئے اور حکمتِ الٰہی اور اس کے اسرارِ نہاں پر سجدۂ شکر بجا لائے۔ اس بارک کا جمعدار چونکہ ایک مسلمان تھا لہٰذا ہمیں کارخانۂ مشقت میں بھی کسی کام پر نہ لگایا گیا بلکہ اللہ کا فضل شاملِ حال ہوا اور سپرنٹنڈنٹ نے خود مجھے اس نمبر کا منشی مقرر کر دیا مگر وہ ڈنڈا جو غالباً کسی بڑے حاکم کے حکم سے تھا بدستور زیب پارہا۔ جب ہر روز صبح کے وقت سپرنٹنڈنٹ صاحب آتے اور مجھے ہر قیدی کی مشقت کا حساب دکھانا پڑتا تو مجھے ہرن کی طرح اچھل اچھل کر ان کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔

## ایک قیدی کا اعلیٰ کردار

ایک دفعہ اتوار کے دن میں اپنے بستر پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک سپرنٹنڈنٹ صاحب ہمارے نمبر میں پہنچے اور تمام قیدیوں کی تلاشی کا حکم دیا۔ یکے بعد دیگرے سب کی تلاشی ہوئی۔ جب میرے بستر کی تلاشی ہوئی تو اس میں سے تھوڑا سا پسا ہوا نمک برآمد ہوا اور یہ ایسا قصور تھا کہ اس کی پاداش میں کوڑوں کی سزا بھی دی جا سکتی تھی۔

جب یہ برآمد شدہ نمک سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش ہوا، تو میں حیران تھا کہ کیا جواب دوں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ صندل نامی ایک مسلمان قیدی جو انبالہ جیل سے میرے ساتھ آیا اور میری خدمت کیا کرتا تھا، کہنے لگا کہ یہ بستر اور نمک تو میرا ہے، مولوی صاحب کا نہیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا یہ کیسے؟ اس نے کہا کہ حضور کے تشریف لانے سے پہلے میں اور مولوی صاحب پیشاب کرنے کے لیے بیت الخلاء میں گئے تھے کہ اسی اثناء میں آپ آ گئے۔ ہم جلدی جلدی جو دوڑ کر آئے تو گھبراہٹ میں ایک دوسرے کے بستر پر بیٹھ گئے۔

سپرنٹنڈنٹ یہ بیان سن کر بہت ہنسا اور کہنے لگا کہ تم مولوی صاحب کو بچانا چاہتے تھے۔ اس کے بعد نمبر سے باہر جہاں کوڑے لگائے جاتے تھے ہم دونوں کو لے گیا۔ دوسرے

جن قیدیوں کے بستروں سے کچھ نکلا تھا انہیں کوڑے لگنے شروع ہوئے، جب سب کو کوڑے لگ چکے تو پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر صندل سے پوچھنے لگا کہ کیا یہ سچ ہے کہ یہ نمک، اور بستر تمہارا ہے، مولوی صاحب کا نہیں ؟ اس نے کہا "جی ہاں! نمک اور بستر تو میرا ہے، آگے آپ کو اختیار ہے" یہ جواب سن کر اس نے ہم دونوں کو بری کر دیا اور کچھ سزا نہ دی اور صندل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اچھا اگر تم مولوی صاحب کو بچانا چاہتے ہو تو ہم نے تم کو بھی معاف کر دیا۔ آئندہ محتاط رہنا۔

## کراچی کو روانگی

اکتوبر ۱۸۶۵ء کے آخری ایام تھے کہ قیدیوں کا ایک بڑا بھاری چالان کیا گیا اور انہیں ملتان روانہ کرنے کے لیے بندوبست کیا جانے لگا اور ایک ہتھکڑی دو دو قیدیوں کے ہاتھوں میں لگا دی گئی۔ میرے ساتھی نے مجھ سے یہ رعایت کی کہ میرا بایاں اور اپنا دایاں ہاتھ ہتھکڑی میں ڈلوایا۔

ہمارے مقدمہ کے فقط تین آدمی یعنی میں، مولانا یحیٰی علی صاحب اور میاں عبدالغفار آج ملتان روانہ ہوئے۔ روانگی کے دن کیفیت یہ تھی کہ سنٹرل جیل سے لاہور ریلوے اسٹیشن تک پاؤں میں بیڑی، سر پر بستر جسے ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں ہتھکڑی کی گلوریٹ، اس پر سپاہیوں کی ڈانٹ ڈپٹ مستزاد کہ جلدی جلدی ... کرو ورنہ ریل چھوٹ جائے گی۔ بہرکیف جب ہم اسٹیشن پر پہنچے تو ہمیں ریل کے ڈبوں میں بند کر کے دروازوں پر قفل چڑھا دیئے گئے اور راستہ میں دروازہ کو کہیں نہ کھولا گیا۔ گویا جانوروں یا مال کی طرح گاڑیوں میں بھر دیا گیا۔

## ملتان میں

رات کے آٹھ بجے کے قریب ہم ملتان پہنچے۔ رات کی تاریکی میں سر پر بستر اٹھائے ہوئے، اسٹیشن سے جیل کی طرف کشاں کشاں چل دیئے، جہاں جانوروں کی طرح بے آب و دانہ ہی بند کر دیئے گئے۔ ہم دو دن ملتان جیل میں رہے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شہر کدھر بستا ہے، بازار کہاں ہے؟؟

دو دن کے بعد ہمیں ملتان سے قریباً پانچ میل کے فاصلے پر دریائے سندھ کے کسی پتن یا گھاٹ سے اگنبوٹ میں سوار کرایا گیا اور اس میں قطار در قطار بٹھا دیا گیا۔ بیڑی، ہتھکڑی اور ڈنڈے تو پہلے سے زیب تن تھے، یہاں ایک بڑی موٹی آہنی زنجیر بھی ہماری بیڑیوں کے درمیان پھنسا دی گئی، جس کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا محال تھا۔ پاخانہ پیشاب بھی اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے کرتے رہے۔ اس وقت قریباً آدھا آدھا من لوہا ہمارے جسم پر تھا۔ اگرچہ دریائے سندھ ہمارے زیرِ پا ٹھاٹھیں مار رہا تھا لیکن ہم اس قدر مجبور و بے بس تھے کہ وضو کرنے کی بھی توفیق نہ تھی لہٰذا پڑے پڑے تیمم سے نمازیں پڑھتے تھے۔ گو ہم یہاں جکڑے پڑے تھے لیکن جیل سے نکل کر دوستوں کی مصاحبت، آبِ دریا کی روانی اور آس پاس کے جنگلوں کی سرسبزی و شادابی کو دیکھ کر نہایت خوش تھے۔

اسی کیفیت میں پانچ چھ روز کے بعد کوٹری پہنچ گئے۔ راستے میں سکھر، بھکر اور ٹھٹھے کے مشہور و معروف قلعے بھی دریائے سندھ کے کنارے نظر آئے۔ کوٹری کے سامنے دریائے سندھ کے دوسرے کنارے، سندھ کا مشہور شہر حیدرآباد بھی دیکھنے میں آیا۔ اسی دن کوٹری سے بذریعہ ریل کراچی پہنچ گئے۔ کراچی میں منشی اور کلرک بڑی بڑی اونچی ٹوپیاں اور ہندو مہاجن بڑی بڑی اونچی پگڑیاں پہنتے تھے۔

جب انبالہ جیل سے روانہ ہوئے تو خیال تھا کہ انگریزی عملداری میں ہر جگہ اردو یا فارسی کا دفتر ہوگا اور ہم منشی گری میں کمال کی وجہ سے محرری کے کام میں رہ کر قید میں آرام سے رہیں گے۔ یہ خیالِ باطل اس قدر مسلط تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا مطلق خیال نہ رہا اور اس کا احساس اس وقت ہوا، جب یہ دیکھا کہ اردو اور فارسی کا دفتر تو ملتان تک ہے۔

سندھ میں ہر جگہ دفتری زبان سندھی تھی۔ سندھی زبان کے حروف اگرچہ فارسی جیسے ہیں لیکن اس کے باوصف ہمارے لیے اس زبان کو سمجھنا نہایت دشوار تھا۔ گویا سندھ میں ہمارا شمار ناخواندہ لوگوں میں ہونے لگا اور وہ جو منشی گری کا غرور تھا یا غیر اللہ پر بھروسہ تھا، خود بخود ختم ہو گیا۔

## کراچی جیل میں

کراچی جیل نسبتاً آرام دہ تھی، یہاں پہنچتے ہی ہتھکڑی اور آڑے ڈنڈے سے نجات مل گئی فقط آہنی بیڑی زیب تن رہی۔ یہاں قیدیوں کو رات کے وقت بند بھی نہیں کرتے تھے، بلکہ انہیں اجازت تھی کہ کھلی فضا میں چٹائیوں پر جہاں چاہتے سو جاتے۔ پہریدار جیل کی فصیل پر گشت کرتے رہتے تھے۔ دو برس کے بعد یہاں پہلی مرتبہ دمکتے موتیوں سے جڑے سیاہی مائل نیلگوں آسمان کے نیچے سوئے دیگر جیل خانوں کی نسبت یہاں قیدیوں کو نہایت عمدہ کھانا ملتا تھا۔ گھی سے چپڑی ہوئی گندم کی روٹیاں عمدہ ترکاری اور گوشت کا مناسب انتظام تھا لیکن آرام کے یہ دن جیسے پلک جھپکتے گزر گئے۔

## صبح سفر، شام سفر

ایک ہفتہ کراچی ٹھہرے، آٹھویں روز ہمیں بحری جہاز میں بوریوں کی طرح بھر کر بمبئی بھیج دیا گیا۔ بادبانی جہازوں اور سمندر کا نظارہ ہم نے سب سے پہلے کراچی میں دیکھا۔ جہاز چونکہ بہت چھوٹا تھا اور قیدیوں کو تہہ خانے میں بھر دیا گیا تھا، اس لیے سب کی زبان پر تھا ؎

جائے تنگ است مرداں بسیار

وقنا ربنا عذاب النار

لنگر اٹھا کر جہاز ابھی تھوڑی دور سمندر میں گیا تھا کہ دریا کے تلاطم اور موجوں کی طغیانی کی وجہ سے ڈگمگانے لگا، جس سے قیدیوں کو قے اور متلی شروع ہو گئی۔ جگہ کی قلت کی وجہ سے ایک دوسرے کے اوپر ہی قے کی جا رہی تھی، جس سے تکلیف میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ جہاز میں کچھ مسلمان بھی سوار تھے جو قیدی نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیں مولوی سمجھتے ہوئے بڑی تواضع کی۔ دو تین روز کے بعد بڑی مشکلات برداشت کرتے ہوئے، ہم بمبئی کی بندرگاہ میں داخل ہوئے وہاں میلوں تک ہزاروں جہاز کھڑے تھے بلکہ جہازوں کی کثرت کے باعث سمندر جہازوں کا جنگل معلوم ہو رہا تھا۔

جہاز سے اترے تو ہمیں بذریعہ ریل بمبئی کے جیل خانہ میں لے جایا گیا، جو کہ وہاں سے

بارہ میل تھا۔ بمبئی میں پارسی مرد عورتیں بکثرت دیکھنے میں آئیں۔ یہ لوگ بڑے خوبصورت اور مالدار تھے اور آتش پرست زردشت کی امت سے تعلق رکھتے تھے۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ کی چڑھائی کے وقت ایران سے بھاگ کر ہندوستان کے اس حصہ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ یہاں تک ہمیں دیکھنے کا موقع ملا بمبئی شہر بھی ایک ٹاپو ہے۔ ایک بند باندھ کر اسے برعظم ہند سے ملا دیا گیا ہے۔ بمبئی اور تھانہ کے درمیان سمندر بہتا ہے، اس کے پانی کو کھیتوں اور کیاریوں میں روک دیا جاتا ہے۔ سمندر کا نمکین پانی جب سورج کی حرارت سے خشک ہوتا ہے، تو وہ خود بخود عمدہ نمک بن جاتا ہے۔ ریلوے لائن کے کنارے ہزاروں من نمک کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ناریل کا درخت اور اس کا تازہ پھل بھی ہم نے پہلے پہل بمبئی میں دیکھا۔
بمبئی کی عورتیں اپنی ساڑھی کو ایسے باندھتی ہیں جیسے مرد دھوتی کو۔ یہاں کے ہندو بڑی بڑی پگڑیاں استعمال کرتے ہیں، جو سر پر ایک ٹوکرے کی طرح رکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس علاقے کی زبان گجراتی یا مرہٹی ہے۔ جب ہم ریل سے اتر کر تھانہ کے بازار میں جیل کی طرف پیدل جا رہے تھے، تو ہمارے چند قیدی ساتھیوں نے کچھ مٹھائی کی دوکانوں کو لوٹ لیا اور بے محابہ مالِ مسروقہ کھانا شروع کر دیا۔ دوکاندار انہیں قیدی سمجھ کر خاموش ہو رہے بلکہ بعض دوکاندار تو بہت خوش ہوئے اور انہوں نے قیدیوں کے منہ میں مٹھائی پڑنے کو بڑا پن سمجھا۔

## تھانہ جیل

چلتے چلتے شام کے قریب ہم تھانہ جیل کے دروازہ پر پہنچے۔ جیل کیا مرہٹوں کے وقت کا ایک بڑا مستحکم اور مضبوط قلعہ تھا، جس کے چاروں طرف ایک بڑی گہری اور پختہ خندق بنی ہوئی تھی۔ جیل میں داخل ہوتے ہی ہماری تلاشی ہوئی اور ہم سب کے جوتے اتروا لیے گئے، جنہیں جاتے وقت بھی واپس نہ کیا گیا۔
سنا ہے کہ ایک دفعہ کسی دل جلے قیدی نے داروغہ جیل کو جوتے مارے تھے، جس کی وجہ سے یہاں یہ قانون بنا دیا گیا کہ کوئی قیدی جیل میں جوتا نہ پہنے بلکہ ننگے پاؤں رہے تاکہ کوئی دوبارہ ایسی نامعقول حرکت نہ کر سکے۔

رات کو ہمیں جوار کی دو دو روٹیاں اور تھوڑی تھوڑی دال دے کر علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ تائید الٰہی کے باعث دوسرے دن پنجابی قیدیوں کو گندم خور علاقے کے باشندے سمجھتے ہوئے گندم کی روٹیاں ملنے لگیں اور اس کے بعد تو یہ قانون بنا دیا گیا کہ پنجاب کے قیدیوں کو یہاں گندم ہی کی روٹی دی جائے گی۔ صبح ہوئی تو ہمیں پتھر توڑنے کی مشقت دی گئی، جسے بمشکل تمام ایک دو دن کیا۔ ہمارے پہنچنے کے بعد یہاں دری بافی کا کام بھی شروع کر دیا گیا۔ پنجابی قیدی اس کام کے مہتمم مقرر ہوئے انہوں نے مجھے اور مولانا یحییٰ علی صاحب کو دری بافوں کا استاد ظاہر کر کے اپنے ساتھ لے لیا اور اس طرح ایک مہینہ بڑے آرام سے گزرا۔

بمبئی کی طرح اس جیل میں بھی مرہٹی زبان کا دفتر تھا۔ اردو اور فارسی خواں یہاں بھی ناخواندوں میں شمار ہوتے تھے۔ کراچی اور تھانہ کے دفتروں کا حال دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا کہ اب باقی عمر ہم ناخواندوں میں شمار ہوں گے اور قلم پکڑنے کی نوبت شاید ہی کبھی آئے۔ اس جیل کا داروغہ ایک برہمن اور بڑا متکبر آدمی تھا مگر نائب داروغہ ابراہیم مسلمان تھا اور حتی المقدور ہماری بڑی تواضع کیا کرتا تھا۔ ایک مہینہ گزارنے کے بعد یہاں سے بھی کوچ کی تیاری ہوئی۔ اس مسلمان نائب داروغہ نے ہماری بھاری بیڑیاں اتروا دیں اور ان کی بجائے ہلکی بیڑیاں ڈلوا دی تھیں۔ ہندوستان کے جیل خانوں میں دیسی لوگوں خصوصاً شریفوں کو بڑی مشکل ہے مگر کوٹ پتلون والے کی بڑی عزت ہے خواہ وہ یورپین ہوں یا ہندوستانی باشندے، دونوں کو صاحب لوگوں کی طرح بڑا چین ہے۔

## کالے پانی کو روانگی

جمنا جہاز ۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو بمبئی سے کالا پانی روانہ ہوا۔ یہ جہاز انگلینڈ کا بنا ہوا تھا۔ تمام عملہ بھی انگریزوں پر مشتمل تھا۔ جب جہاز نے لنگر اٹھایا، تو عرشے پر کھڑے ہوئے تمام اسیران بلا نے مادر وطن پر آخری محبت بھری نظر ڈالی۔ کچھ قیدی ایسے بھی تھے جن کی محبت کا محور، گھر بار، کھیتی باڑی، ماں باپ، بہن بھائی اور اولاد تھی اور انہیں یہ خیال بھی شدت سے ستا رہا تھا کہ وہ جیتے جی اپنے اعزا و اقارب، پیاروں

راج دلاروں اور سرسبز وشاداب کھیتوں کو بھی دیکھ سکیں گے یا نہیں؟ — لیکن ان میں سے کچھ نیک بخت ایسے بھی تھے جن کے حاشیہ خیال اور قلب و نگاہ کے کسی گوشے میں بھی ان میں سے کوئی چیز نہ تھی۔ ان کی محبت کا مرکز و محور صرف وہ دعوتِ حق تھی جس کے لیے انہوں نے اپنی ہر قیمتی سے قیمتی متاع کو قربان کر دیا تھا، وہ اپنی کشتیاں جلا کر آ رہے تھے، انہیں اس بات کی قطعاً پرواہ نہ تھی کہ وہ ایک ایسی بھیانک جگہ جا رہے ہیں، جہاں کے شب و روز نا معلوم کتنے کربناک ہوں گے —— انہیں خیال تھا تو صرف اس تحریک کا جسے وہ خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر سیراب کر رہے تھے۔ جب تک ساحل نظروں سے اوجھل نہ ہوا، قیدی اپنے اپنے خیالات میں گم سم حیرت کی تصویر بنے اسے تکتے رہے۔ جب نظروں سے اوجھل ہو گیا تو کتنے ہی دلوں سے اٹھنے والا دھواں، عارض کے زمہریر میں پہنچ کر پانی کے قطرات کی صورت اختیار کر گیا۔ اب وہ تھے، ان کے رخسار پر شبنم کے قطرات جیسے آنسو یا پھر چار سو حدِ نظر تک پھیلا ہوا سمندر کا پانی۔ ان کے جذبات کی طرح سمندر بھی رفتہ رفتہ طغیانی رنگ اختیار کرتا گیا ؎

دریا کو اپنی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو، یا درمیاں رہے

سمندر کی تلاطم خیزیوں کے باعث اکثر قیدی بیمار پڑ گئے۔ ایک بے چارہ پنجابی قیدی داغِ مفارقت بھی دے گیا۔ ہم نے قاعدۂ شریعت کے مطابق اسے غسل دیا، کفن پہنایا اور نمازِ جنازہ پڑھ کر اس کی لاش کے ساتھ بہت سے پتھر باندھے اور اسے سمندر میں چھوڑ دیا۔ سیلون پہنچے تو سمندر کا تلاطم مزید شدت اختیار کر گیا۔ سینکڑوں ٹن وزنی جہاز، ایک ننھے سے بچے کی گیند کی طرح پانی کی سطح پر اچھل رہا تھا۔ پہاڑ کی طرح دیو قامت اور بلند و بالا موجیں ایک طرف سے آتیں، کبھی دوسری جانب سے اور اسے بری طرح ہلا کر رکھ دیتیں۔ کبھی اوپر سے گزر جاتیں اور کبھی نیچے سے اور یوں معلوم ہوتا کہ جہاز ابھی غرق ہو جائے گا۔ خوف کے مارے لوگوں کا برا حال تھا۔ وہ چیخ چیخ کر خدا کو پکار رہے تھے۔ آخر کار کئی گھنٹے بعد طوفان تھما اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔

۳۴ ویں دن ۱۱ر جنوری ۱۹۶۶ء کو جہاز قبل از دوپہر پورٹ بلیر انڈمان پہنچ گیا۔ انبالہ سے لے کر انڈمان کے پانیوں میں داخل ہونے کی کل مدت ۱۱ ماہ ہے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے ہرے بھرے جزیرے دور سے پھیلی ہوئی گہری سبز چادر کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ اب ساحل بھی نظر آرہا تھا۔ قیدیوں کی ایک جماعت عرشے پر آکر کھڑی ہوگئی۔ دور سے سمندر کے کنارے کے کالے پتھر ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے بھینسوں کے جھنڈ کے جھنڈ پانی میں بکھر رہے ہوں۔ ایک کشتی میں پورٹ بلیر کے محافظ آپہنچے اور جہاز لنگر انداز ہو گئے۔ میں نے ایک ہندوستانی ملاح سے پوچھا کہ یہاں منشی اور محرروں کی بھی کچھ قدر ہے یا نہیں؟ دوسرا سوال میں نے یہ پوچھا کہ یہاں کا دفتر کس زبان میں ہے؟ اس نے قرینہ سے معلوم کر لیا کہ یہ شخص منشی ہے، چنانچہ اس نے میری تسلی کے لیے مبالغہ آرائی کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کے حاکم اور مالک تو منشی ہی ہیں۔ یہ مژدہ سن کر مجھے بھی کچھ تسلی ہوئی۔

جہاز لنگر انداز ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی بڑی کشتیاں پہنچ گئیں۔ تمام قیدیوں کو ان میں بٹھا کر انڈمان کے صدر مقام روس کی طرف روانہ کر دیا۔ ساحل سمندر پر ایک جم غفیر کھڑا تھا، وضع قطع سے سب لوگ پڑھے لکھے مولوی اور منشی معلوم ہوتے تھے۔ بیسیوں لوگ سفید فاخرانہ لباس زیب تن کیے، ہمارے منتظر کھڑے تھے۔ ابھی ہم کشتی میں سوار ہی تھے کہ کنارے پر کھڑے ایک آدمی نے بلند آواز سے پوچھا:-

"محمد جعفر اور مولوی یحییٰ علی صاحب بھی اس جہاز سے آئے ہیں"؟

"جی ہاں! وہ دونوں آئے ہیں" میں نے جواب دیا۔

یہ سنتا تھا کہ وہ لوگ پانی میں کود پڑے اور ہم لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ کشتی سے نیچے اتار لیا۔

## مولانا احمد اللہ سے ملاقات

ساحل پر قدم رنجہ ہوتے ہی، سب سے پہلے یہ خبر ملی کہ مولانا احمد اللہ صاحب چھ ماہ قبل ۱۵ر جون ۱۸۶۵ء کو یہاں پہنچ گئے تھے۔ یہ لوگ انہی کے بھیجے ہوئے آئے تھے۔ آپ کو ہمارے

آنے کی خبر دو روز پہلے پہنچنے والے جہاز کے ان قیدیوں نے دی تھی جو تھانہ جیل سے بمبئی تک ان کے ساتھ آئے تھے۔

مولانا احمد اللہ، انڈمان کے چیف کمشنر میر منشی سید اکبر زمان کے مکان پر مقیم تھے۔ بندرگاہ سے ہم سیدھے وہیں گئے۔ آپ کے ساتھ اور بھی کئی معززین منتظر تھے۔ ملاقات کا یہ نظارہ بہت رقت انگیز تھا۔ مصافحے اور معانقے کے بعد بیڑیاں کاٹ پھینکی گئیں۔ عمدہ لباس پہلے سے تیار کرالیا گیا تھا۔ ہم نے گیروے کپڑے اتار دیئے اور نہا دھو کر اسے زیب تن کر لیا، پھر دسترخوان بچھا دیا گیا، جس پر انواع واقسام کے لذیذ کھانے چنے گئے تھے۔ تین برس بعد پہلی مرتبہ پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اگرچہ اسی تاریخ سے ہم قید سے رہا ہو گئے تھے اور پھر کبھی بارک، قیدیوں کا لباس یا قیدیوں کا کھانا نہیں دیکھا لیکن اس کے باوجود ہم اٹھارہ برس تک کالے پانی میں ملزموں ہی کی طرح رہے۔

اسی شام سے گھر گھر ہماری دعوتیں ہونے لگیں اور وہ نفیس اور عمدہ کھانے کھلائے گئے کہ ہندوستان میں کبھی نصیب نہ ہوئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اب ساری عمر جیل کا کھانا کھانا پڑے گا۔ لیکن اس قادر مطلق نے جب یہاں نعم البدل عنایت فرما دیا، تو یہ خیال دل سے محو ہو گیا۔

جب اس جزیرے میں پہنچے تو دیکھا کہ ہزاروں قیدی مرد عورتوں کی پیشانیوں کو کھود کر ان کا نام، جرم اور لفظ دائم الحبس کندہ کرایا ہوا تھا کہ وہ نوشتہ تقدیر کی طرح ساری عمر نہیں مٹ سکتا تھا لیکن مقام شکر ہے کہ ہمارے یہاں پہنچنے سے کچھ عرصہ قبل تمام عملداری سرکار میں یہ حکم موقوف کر دیا گیا۔ ہم اس داغ دائم الحبس سے محفوظ رہے۔

**جزائر انڈمان**

جزائر انڈمان خلیج بنگال کے مشرق میں ۹۲ درجہ ۴۷ دقیقہ طول شرقی اور ۱۲ درجہ ۴۳ دقیقہ عرض شمالی پر، کلکتہ سے چھ سو میل کی مسافت پر واقع ہیں۔ ایک ہزار جزیروں کا یہ مجموعہ ۲۶۰۷ میل کے رقبہ پر مشتمل ہے۔ علم طبقات الارض کے

ماہرین کا کہنا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ جزائر برّ اعظم ایشیا سے ملے ہوئے تھے اور پھر حوادث زمانہ اور سمندر کی موجوں کے باعث اوّلاً برّ اعظم ایشیا سے الگ ہو گئے ثانیاً ایک دوسرے سے بھی علیحدہ ہو گئے اور چھوٹے چھوٹے ہزاروں جزیروں میں تقسیم ہو گئے۔

کلکتہ سے اگبوٹ یہاں پانچ روز میں پہنچتا ہے اور رنگون سے تین روز میں۔ مولمین یہاں سے تین سو میل مشرق و شمال میں، سنگاپور چار سو میل مشرق و جنوب میں، نیانگ تین سو پچاس میل مشرق میں، نکوباریا نکوڑی اسّی میل جنوب میں، مدراس آٹھ سو میل مغرب میں اور لنکا آٹھ سو میل مغرب و جنوب میں واقع ہے۔ یہ سب جزائر پہاڑ ہیں، ہموار زمین بہت کم ہے یہاں سب سے اونچا پہاڑ مونٹ ہریٹ ہے، جو سطح سمندر سے ۱۱۱۶ فٹ اونچا ہے۔

یہاں میٹھے پانی کا کوئی ندی نالہ جاری نہیں ہے۔ موسم برسات میں بعض اونچے ٹیلوں سے پانی کے جھرنے بہا کرتے ہیں، لیکن ایام خشکی میں بند ہو جاتے ہیں۔ کنوئیں وغیرہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ پورٹ بلیر کے زیریں علاقے میں گندھک کا ایک پہاڑ ہے، جس سے ہر وقت آگ کے شعلے نکلتے رہتے ہیں۔

یہاں کے جنگلات میں خنزیر کے علاوہ اور کوئی چوپایہ، درندہ یا پرندہ نہیں ہے۔ لعاب ابابیل یہاں کا ایک عمدہ تحفہ ہے، جو قوت باہ کے لئے ماہی سقنقور سے بھی بڑھ کر سمجھا جاتا ہے اور سونے چاندی کی طرح بہت گراں ہوتا ہے۔ جنگلات میں ہزار ہا قسم کی عمدہ اور پائیدار لکڑی موجود ہے اور ہمارے علاقے کی لکڑی سے بالکل مختلف ہے۔ بید کئی قسم کا ہے اور اس کی لکڑی دیگر ممالک میں بطور تحفہ بھیجی جاتی ہے۔ کالی ناگنی کی طرح عقیق البحر کی چھڑیاں، ہزار ہا قسم کی رنگ برنگ کی کوڑیاں اور طرح طرح کی سیپیاں یہاں کے سمندر سے نکلتی ہیں اور دوسرے ملکوں میں بطور تحفہ بھیجی جاتی ہیں۔

**پیداوار اور آب و ہوا** — آم، املی، جامن، کٹھل، بڑہل، جائفل اور پان وغیرہ گرم ملکوں کے درخت یہاں کے جنگلات میں خود بخود

اُگے ہوتے ہیں جنگل کو صاف کر کے پچاس سو گاؤں آباد کیے گئے ہیں۔ ہر قسم کی ترکاری، گرم ملکوں کے پھل اور دھان، مکئی، جوار، مونگ،، ماش اور نیشکر وغیرہ کثرت سے یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ سرد ملکوں کے اناج گندم اور چنا وغیرہ بالکل پیدا نہیں ہوتے۔ اس کا حکومت نے انتظام کر رکھا ہے کہ وہ کلکتہ سے گندم اور چنے وغیرہ لا کر سات پائی فی پونڈ یعنی سوا آنہ فی سیر کے حساب سے فروخت کرتی ہے۔ یہاں غلّے کا نرخ ہمیشہ ایک رہتا ہے اور اس ملک میں کبھی قحط بھی نہیں پڑتا۔

اس جزیرے کی آب و ہوا اتنی عمدہ اور صحت بخش ہے کہ روئے زمین پر اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہیضہ، چیچک، وبائی بخار اور آشوبِ چشم وغیرہ متعدی امراض یہاں بالکل نہیں ہوتے۔ بیس برس کے عرصہ میں ہم نے نہیں سنا کہ کوئی آدمی ان میں سے کسی بیماری میں مبتلا ہوا ہو۔ یہاں سر اور کپڑوں میں جوئیں بھی نہیں پڑتیں اور نہ ہی پسّو اور مچھر جیسے موذی جانور رہتے ہیں۔ خطِ استوا سے قریب ہونے کے باعث یہاں بارش بکثرت ہوتی ہے اور دن رات برابر ہیں۔ سردی کی شدت ہوتی ہے نہ گرمی کی بلکہ سارا سال موسم معتدل رہتا ہے۔ دسمبر اور جنوری کی راتوں میں بھی صرف ایک چادر اوڑھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سرمائی کپڑوں کا بالکل دستور نہیں، کوئی رضائی بناتا ہے نہ تلائی، روئی ہوتی ہے نہ دھنیا، خزاں ہے نہ بہار بالکل سارا سال موسم معتدل رہتا ہے اور بارہ مہینے درخت ہرے بھرے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ حکیم و علیم نے موسموں کو یہاں کے جنگلیوں کی رعایت رکھتے ہوئے بنایا ہے، جو کہ ہمیشہ مادر زاد برہنہ رہتے ہیں۔ اگر گرمی سردی کی شدت ہو تو یہ برہنہ مخلوق خدا فوراً ہلاک ہو جائے۔

بارش تو اس کثرت سے ہوتی ہے کہ مئی سے دسمبر تک پورے آٹھ مہینے بادل برستے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مکانوں کی چھتوں کو ڈھلوان دار بنایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی کچی اور چپٹی چھتیں یہاں کی بارش کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ بارش تو موسلا دار ہوتی ہے لیکن اولے پڑتے ہیں، نہ کبھی آندھی آتی ہے

ان جزائر کے جنگلات نہایت گنجان اور دشوار گزار ہیں۔ ان میں درخت اتنے اونچے ہوتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب کسی درخت کو کاٹ کر گرایا جاتا ہے، تو اس کی ڈالیوں اور شاخوں سے سینکڑوں گز تک زمین متاثر ہوتی ہے۔ یہاں کے سانپ اور بچھو میں زہر نہیں لیکن کنکھجورے بہت زہریلے ہوتے ہیں۔

جنگلات میں زمانۂ قدیم سے ایک وحشی اور مادرزاد قوم آباد چلی آرہی ہے۔ مرد عورتیں بالکل کپڑا نہیں پہنتے اور نہ ہی انہیں کپڑا میسر ہے۔ ان کا ابھی تک صحیح حال بھی دریافت نہیں ہو سکا کہ وہ کس ملک سے اور کب آکر یہاں سکونت پذیر ہوئے ہیں؟ ہمیشہ سے وحشی چلے آرہے ہیں یا کبھی مہذب بھی تھے؟ جیسا کہ مشہور تھا یہ جنگلی آدم خور نہیں ہیں۔ ان کے بدن پر بال بھی ہیں۔

## انڈمان کی نوآبادی

سو برس کے قریب ہوئے، ایک جہازران لیفٹیننٹ بلیر نے آکر یہاں سب سے پہلے لنگر ڈالا تھا۔ اسی وجہ سے اس جزیرے کو پورٹ بلیر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس وقت بھی سرکار نے تجویز کیا تھا کہ قیدیانِ حبس بعبور دریائے شور کو یہاں رکھا جائے گا لیکن یہ جزیرہ آباد ہو کر، آب و ہوا کے ناموافق ہونے کے باعث ۱۷۹۶ء میں پھر اجڑ گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سرکار کو پھر ضرورت محسوس ہوئی کہ اسے آباد کیا جائے کیونکہ آزادی کی جنگ میں حصہ لینے والے کئی ہزار "باغیوں" کو جیل میں رکھنا ممکن نہ تھا، چنانچہ مارچ ۱۸۵۷ء سے "بغاوت" کے جرم میں ماخوذ قیدیوں کو یہاں بھیج کر اس جزیرہ کو دوبارہ آباد کر دیا گیا ہے۔

## اصلی باشندے

شروع شروع میں جب قیدی یہاں آکر آباد ہوئے، تو مدت تک جنگلی لوگوں نے سخت مخالفت کی؛ چنانچہ انہوں نے یہاں کے پہلے سپرنٹنڈنٹ اور کمشنر ڈاکٹر واکر کے عہد میں ایک بہت بڑی فوج ظفر موج کے ساتھ ہدو اور رابرٹ ڈین پر حملہ کر کے بہت خون خرابے کیے تھے لیکن اب وہ سرکار

کی حکمتِ عملی اور ملائمت کے باعث فرمانبردار بن گئے ہیں اور جنگل یا بستی میں جہاں کہیں ملتے ہیں، بڑی خاطرداری سے پیش آتے ہیں۔

ان لوگوں کا قد چار سے پانچ فٹ چار انچ تک لمبا ہے۔ شکل و صورت میں بالکل حبشیوں جیسے ہیں۔ سیاہ فام، گول سر، آنکھیں ابھری ہوئیں، سر پر بھیڑ کے سے بال مگر نہایت مضبوط اور قوی، یہ ان کا حلیہ ہے۔ کل جزائر انڈمان میں ان کی بارہ ذاتیں ہیں۔ ہر ذات کی زبان دوسری سے بہت کم ملتی ہے۔

## مذہبی خیالات

یہ جنگلی اس بات کے قائل ہیں کہ خدا آسمان میں رہتا ہے، وہی ہر چیز کا خالق ہے اور سب سے بڑا ہے۔ وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، آسمان میں اس کا نہایت عمدہ اور نفیس محل ہے، اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اسی کے گھر سے پانی برستا ہے، بجلی کا شعلہ اور کڑک بھی اسی کے پاس سے آتی ہے، موت بھی اسی کے حکم سے ہوتی ہے، بھلائی اور رزق بھی وہی دیتا ہے، ان جنگلیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ چانا پالک اس کی بیوی ہے اور اسے بھی فنا نہیں اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کا کام ہے کہ سمندر میں مچھلیاں پیدا کرے، وہی مچھلیوں کو آسمان سے گراتی ہے۔

یہ لوگ شیطان کے بھی قائل ہیں اور سمجھتے کہ سب برے کام شیطان کرتا ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ شیطان دو ہیں ایک زمین کا جس کا نام ارم چوگلا ہے۔ جب زمین پر کوئی ناگہانی موت سے مر جاتا ہے، تو یہ سمجھتے ہیں کہ ارم چوگلا نے مار ڈالا ہے۔ ایک سمندر کا شیطان ہے جس کا نام جورو ونڈا ہے۔ جب کوئی ڈوب کر مرجاتا ہے، تو کہتے ہیں کہ اس کو جورو ونڈا نے مار ڈالا ہے۔

یہ لوگ فرشتوں کے بھی قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ مذکر مؤنث دونوں جنس سے ہیں جنگل میں رہتے ہیں اور انسانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھوت پریت کے بھی قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ انہیں کچھ اختیار نہیں ہے۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ یا کسی دوسری چیز کی قطعاً عبادت نہیں کرتے۔

یہ لوگ طوفانِ نوح کے بھی قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ زمین پر ایسا طوفان آیا تھا کہ ساری دنیا ڈوب گئی تھی اور ان کے بزرگ ایک کشتی بنا کر اس میں سوار ہو گئے تھے اور ایام طوفان میں بہت دنوں تک اس کشتی میں سوار رہے۔ جب طوفان ختم ہوا تو وہ کشتی جزائر انڈمان کے پہاڑوں میں سے کسی ایک پہاڑ پر آ کر رک گئی تھی۔

## سماجی زندگی

یہ لوگ دو سے زیادہ گنتی نہیں جانتے، جب دو سے زیادہ کسی چیز کی گنتی کرنی ہو، تو انگلیوں پر شمار کرتے ہیں۔ یہ ہمیشہ مادر زاد برہنہ رہتے ہیں البتہ عورتیں اندامِ نہانی پر ایک چھوٹا سا کپڑا ڈال لیتی ہیں۔ مرد عورتیں جسم کے کسی حصہ پر بال رکھنے کے قائل نہیں۔ جسم کے تمام بالوں کو بوتلوں کے ٹکڑوں کے ساتھ تراش ڈالتے ہیں۔

ان کے ہاں شادی بیاہ بھی نہایت سیدھے سادے طریقے پر ہوتے ہیں۔ شادی کے وقت دولہا اور دلہن دونوں کو گیرو رنگ کی چربی سے رنگ دیا جاتا ہے۔ شادی کے موقعہ پر قوم کے تمام افراد جمع ہوتے ہیں۔ اجتماع میں ایک آدمی بطور قاضی نظر آتا ہے، وہی دولہا کو اٹھا کر دلہن کے پاس لے جاتا ہے اور دولہا کے سامنے بہت سے تیر و کمان رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ان سے شکار کر کے اپنی عورت کی پرورش کرنا اور پھر وہی شخص بلند آواز کے ساتھ کہتا ہے "آب اِک" یعنی لے جاؤ یہ تمہاری بیوی ہے۔ یہ کہنے کے بعد عقد پختہ ہو جاتا ہے اور پھر تا حیات دونوں کے ہاں طلاق ہے نہ جدائی۔ شادی کے بعد ان کے ہاں زنا بھی نہیں ہے۔

بچے کی پیدائش کے موقعہ پر بھی عورتیں پردے کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں بلکہ مردوں کے سامنے ہی بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ پیدائش کے بعد ایک عورت پتوں کے ساتھ مکھیوں کو دور کرتی ہے جبکہ ایک دوسری عورت نال کاٹ کر بچے کو گود میں لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ پہلے دن بچے کو کوئی دوسری عورت دودھ پلاتی ہے لیکن دوسرے دن سے بچے کی ماں دودھ پلانے لگ جاتی ہے۔ وضع حمل کے فوراً بعد زچہ چلنے پھرنے لگ جاتی ہے، جنگل کی ہر چیز کھاتی پیتی ہے، ان کے ہاں کسی قسم کے پرہیز کا قطعاً رواج نہیں۔ بچہ جب چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے، تو نیز کٹھ

اس کا پہلا کھیل ہوتا ہے۔

ان لوگوں کا گھر بالکل چھوٹا سا ہوتا ہے۔ صرف چار کھمبے کھڑے کرکے، ان پر پتے ڈال لیتے ہیں اور ایک چندروزہ آسرا بنا لیتے ہیں۔ ان کے گھروں میں جاکر دیکھو تو میاں بیوی کے علاوہ اور کوئی چیز نظر نہ آئے گی۔ تیر کمان ان کی اصل جائیداد کُل جہان ہیں۔

یہ لوگ چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی بنا لیتے ہیں، جن کے ذریعہ ایک جزیرہ سے دوسرے جزیرہ تک آتے جاتے ہیں۔ یہ اپنے مردوں کی کھوپڑیاں بھی ساتھ ساتھ لیے پھرتے رہتے ہیں کسی دوسرے جزیرہ سے جب کوئی مہمان ان کے ہاں آتا ہے، تو اسے پہلے گھر سے تھوڑے سے فاصلہ پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ گھر والے اسے وہاں کھانا پہنچاتے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد وہ جس گھر میں چاہتا ہے چلا جاتا ہے۔ پھر سب اس سے مل کر روتے ہیں۔

یہاں کے باشندے کھیتی باڑی بالکل نہیں کرتے اور نہ اناج کھاتے ہیں۔ ان کا کھانا مچھلی، سمندر کے کیڑے، گوشت اور گھونگے وغیرہ ہیں۔ آگ پر نیم بریاں کرکے نمک مرچ کے بغیر کھاتے ہیں بعض درختوں کی جڑیں، پھلیاں، پھل، پتے، سور کا گوشت اور شہد بھی ان کی خوراک میں شامل ہے۔

غوطہ زنی کے یہ بچپن سے عادی ہوتے ہیں، اس فن میں شاید دنیا کی کوئی قوم بھی سبقت نہ لے جا سکے۔ یہ بلا کے تیرانداز ہوتے ہیں، ان کا نشانہ بہت ہی کم خطا ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں ہوتا، خون نکالنے ہی کو ہر مرض کا علاج تصور کیا جاتا ہے، جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو وہ خود یا اس کا کوئی عزیز نہایت بے دردی اور اناڑی پن سے بوتل کے ٹکڑوں سے زخم کرکے خون نکال دیتا ہے۔

جب کوئی مر جاتا ہے تو اسے ایک ٹوکری میں رکھ کر، اس کے گھٹنوں کو مروڑ کر اس کی چھاتی پر لاکر باندھ دیتے ہیں، سارے اعضاء کو درخت کے چھلکوں سے کس دیتے ہیں اور پھر قبر کھود کر اس میں گاڑ دیتے ہیں۔ قبر کے نزدیک آگ جلاتے رہتے ہیں۔ ایک دو ماہ کے

بعد اس کی قبر کو کھود کر اس کا ماتم کیا جاتا ہے اور اس کی ہڈیوں کو سب عزیز آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور پھر انہیں حرز جان سمجھ کر ہمیشہ اپنے پاس رکھتے ہیں کبھی کبھی لاشوں کو گاڑنے کے بجائے مچان پر رکھ دیا جاتا ہے یا درختوں کی شاخوں پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ یہ دوبارہ زندہ ہونے، جزا سزا اور آخرت کے قائل نہیں ہیں۔

یہ لوگ ناچنے گانے کے شوقین ہیں مگر ناچنے گانے کے آلات سے یکسر ناآشنا۔ ان لوگوں کا کوئی مذہب نہیں۔ ان میں کسی مذہبی سردار یا رہنما کا بھی کوئی تصور نہیں، اس کے باوجود اخلاق، آدمیت، دیانت داری اور راست بازی کے اوصاف کے ساتھ متصف ہیں۔

ابتدا میں یہ لوگ روپیہ پیسہ کی قدر و قیمت سے ناواقف تھے۔ اگر کوئی شخص دیتا تو لے لیتے اور پھر دیکھ بھال کر زمین پر پھینک دیتے تھے، مگر اب تو بہت لالچی ہو گئے ہیں اور راہ گیروں سے پیسہ پیسہ کا سوال کرتے ہیں۔

ان کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ لڑکیاں جلد بالغ ہو جاتی ہیں اور تیس سال کی عمر میں تو بہت بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ بہت عرصہ ہوا دو دھو ناتھ نامی ایک شخص نے ایک جنگلی عورت سے شادی کی تھی مگر رہائی ہو جانے کے باعث اس بے چاری کو یہیں چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا تھا۔

۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۵ء تک ان جزائر کی آب و ہوا سم قاتل تھی۔ جس کو زخم ہو جاتا تیسرے روز سڑ جاتا اور چوتھے روز مر جاتا۔ زخم کیا ہوتا گویا پیغام اجل ہوتا۔ جب آبادی یہاں شروع ہوئی، تو ان دنوں مرض اسکروبی (SCO RBUTUS) بھی بڑے زور سے پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک جہازی بیماری ہے، جس سے منہ پک جاتا ہے، پنڈلیاں سخت ہو جاتی ہیں اور آدمی مر جاتا ہے، اس مرض میں مبتلا ہو کر یہاں ہزاروں آدمی راہگرائے آخرت ہوئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے پہنچنے سے ایک سال قبل یہاں کی تمام بیماریاں ختم ہو گئی تھیں اب تو آب و ہوا کی خوبی کے اعتبار سے یہ جزیرہ رشک کشمیر تھا، جہاں بیس برس تک ہمارے

سر میں درد بھی نہ ہوا اور قید کی زندگی بڑے آرام و راحت کے ساتھ بسر ہوئی۔

بیماری کی کثرت اور آبادی کے نئے ہونے کی وجہ سے، ابتدا میں انگریزوں نے قیدیوں کے لیے بڑے نرم قوانین رکھے تھے اور ان سے اچھا سلوک کرتے تھے لیکن جب آب و ہوا اچھی ہوگئی اور آبادی بھی بڑھ گئی تو کالا پانی کے لیے ایسے ایسے سخت قانون بنائے گئے کہ الامان الحفیظ۔ ہم جس زمانہ میں پہنچے آب و ہوا تو عمدہ ہوگئی تھی لیکن ابھی تک قانون میں سختی کے احکام جاری نہیں ہوئے تھے، اس وجہ سے ہمیں پہنچتے ہی ان جزائر کے عام قوانین کے مطابق عہدے، تنخواہیں اور آرام و آسائش کی سہولتیں میسر آگئی تھیں۔

ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ قانون میں سختی کی جانے لگی حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ نئے قیدیوں کو حکم تھا کہ دس برس تک سخت مشقت کریں، بھنڈارے سے کھانا کھائیں وردی کا کپڑا پہنیں، بارک میں رہیں اور انہیں کسی قسم کی سہولت مہیا نہ کی جائے؛ چنانچہ قانون انڈمان مجریہ ۱۸۶۷ء سے ایک فقرہ بطور مثال لکھتا ہوں:۔

"سزا حبس بعبور دریائے شور کا مطلب یہ ہے کہ قیدیوں سے سخت سے سخت مشقت لی جائے اور کھانے پینے کو صرف اس قدر دیا جائے کہ جسم و جان کا رشتہ قائم رہ سکے۔"

مگر اس میں خیریت کا پہلو یہ تھا کہ ان قوانین کا اطلاق صرف نئے قیدیوں پر ہوتا تھا، ہم پرانے زندانی ان سے مستثنیٰ قرار دے دیئے جاتے تھے۔

## جنگِ آزادی کے قیدی

میں نے یہاں آکر دیکھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی بدولت یہاں بیسیوں راجے، نواب، زمیندار، مولوی مفتی، قاضی، ڈپٹی کلکٹر، منصف، صدر امین، صدر الصدور، رسالدار اور صوبے دار وغیرہ سنتِ یوسفی ادا کر رہے ہیں۔

## نسلی امتیاز

وہ معزز ہندوستانی جن کے آگے سینکڑوں ہزاروں نوکر تھے انہیں

بھی سیاہ رنگت اور ہندوستانی باشندے ہونے کی وجہ سے دوسرے چوہڑے چماروں کی طرح موٹا جھوٹا کھانا دیا جاتا اور عام لوگوں کے ساتھ ان سے بھی مشقت لی جاتی تھی۔ مگر یورپین گورے بلکہ اکثر دوگلے کالے کلوٹے بھی فقط کوٹ پتلون کے شرف یا عیسائی کلمہ پڑھنے کی وجہ سے پلٹن کے گوروں کے ہمراہ کھانے اور کپڑے کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ ان کے رہنے کے لیے الگ بنگلے اور خدمت کے لیے بلا تنخواہ نوکر مامور تھے۔ اور یہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جس گورے یا دوگلے کو لائسنس مل جاتا، اس کو تو پچاس روپیہ ماہوار تک نقد تنخواہ بھی ملتی تھی۔

۱۸۷۹ء میں ایک نیا عبرت انگیز واقعہ پیش آیا جسے دیکھ کر لوگوں کو رونا آتا تھا اور وہ یہ کہ اسی سال ایک بدبخت راجہ جگن ناتھ پوری ــــ جس کے لیے مدت تک اخباروں نے بھی سر پھوڑا تھا ــــ قید ہو کر کالا پانی پہنچا۔ چہرے کی رنگت کے سیاہ ہونے کے باعث وہ بے چارہ عام چوہڑے چماروں کے ساتھ کھانا کھاتا اور مشقت کرتا تھا۔ جب نازک مزاجی کے سبب مشقت نہ کر سکتا تھا تو جیل، بینت اور چکی پیسنے کی سزا پاتا۔ آخرکار ان صدموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جیل میں چل بسا۔

انہی دنوں مسٹر لیمسٹر نامی ایک کرانی بھی یہیں پہنچا جو کرانوے سے قید ہو کر آیا تھا۔ وہ بھی اگرچہ رنگ کا کالا تھا، لیکن کوٹ پتلون پہننے اور یورپ کا باشندہ ہونے کے باعث گوروں کے ساتھ عمدہ کھانا کھاتا تھا۔ رہنے کے لیے اسے ایک الگ مکان مل گیا جس میں عیش و آرام کا سب سامان تھا۔ مشقت کے بجائے اس پر یہ انعام کیا گیا کہ اسے ڈپٹی کمشنر کی کچہری میں کلرک لگا دیا گیا۔ چونکہ یہ کمبخت راجہ اور یہ خوش نصیب کرانی یہاں بیک وقت پہنچے تھے، اس لیے اس اختلافِ سلوک اور طرفداری کو دیکھ کر ہر ایک کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

**ملازمت**

ہمارے انڈمان پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد کا واقعہ ہے کہ سراوک کے راجہ بروکس نے اپنی مدد کے لیے کچھ قیدیوں کو طلب کیا؛ چنانچہ حکومتِ ہند نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے پچاس قیدیوں کو جن میں سے اکثر منشی اور جمعدار وغیرہ تھے،

بروکس کے پاس بھیج دیئے۔ ان قیدیوں کے جانے کی وجہ سے کئی عمدہ عمدہ عہدے خالی ہو گئے تھے۔ اخبارات کے ذریعہ اور مولانا احمد اللہ سے ان لوگوں کو میری قابلیت کا علم ہو چکا تھا۔ اس لیے اللہ کے فضل سے جہاز سے اترتے ہی مجھے سپرنٹنڈنٹ اور چیف کمشنر کی کچہری میں محرر سیکشن اور نائب میر منشی مقرر کر دیا گیا۔ رہنے کے لیے ایک مکان اور خدمت کے لیے ایک تنخواہ دار نوکر بھی مل گیا۔ آزاد بندوں کی طرح جہاں چاہتا رہتا اور جہاں چاہتا جاتا، مطلق روک ٹوک نہ تھی۔

## شادی خانہ آبادی

جب میں یہاں پہنچا تو میرا عالم شباب تھا، عمر کی ستائیسویں منزل میں تھا۔ عمر کے اس حصہ میں مجرد رہنا دینی و دنیوی قباحتوں سے خالی نہ تھا۔ اس لیے پہلے تو میں نے ارادہ کر لیا کہ اپنے ملک سے اپنی بیوی کو بلالوں لیکن قانون اس سلسلہ میں مانع تھا۔ پھر میں نے چند ماہ بعد ایک نو آمدہ کشمیری عورت سے شادی کر لی، جو کہ نہایت کمسن تھی اور کسی بلائے ناگہانی میں گرفتار ہو کر یہاں آئی تھی۔ میرے حبالۂ عقد میں آنے کے بعد بڑی دیندار اور خدمت گزار بن گئی۔

میں نے یہاں آکر محسوس کیا کہ ہر وہ چیز جو ہندوستان میں مجھ سے چھوٹی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کا نعم البدل عطا فرمانا شروع کر دیا۔ جن لوگوں نے میری دشمنی پر کمر باندھی تھی، وہ ایک ایک کر کے تباہ و برباد ہو گئے۔ حتیٰ کہ جب میں ہندوستان آیا تو ہر شخص حسب مدارج اپنی سزا حاصل کر چکا تھا۔

## مولانا عبدالرحیم

زمانۂ قید میں ۲۵ دسمبر ۱۸۶۷ء کو میں جزیرہ پرسو پلینٹ میں تھا کہ مولانا عبدالرحیم صاحب بھی انڈمان پہنچ گئے پہلے تو آپ گھاٹ منشی مقرر کیا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد آپ کو ہسپتال میں محرر مقرر کر دیا گیا۔ نو برس تک سرکاری کام کرنے کے بعد انہوں نے بزازی کی دوکان کھولنے کا ٹکٹ لے لیا، جب رہائی ہوئی تو اس وقت بھی اسی پیشہ دوکانداری سے منسلک تھے۔

## تین مہلک حادثے

سمندر کے کنارے آباد ملکوں، جہاز کے ملازموں او

سیاحوں کو اکثر بحری آفات میں بھی مبتلا ہونا پڑتا ہے، جن سے ہندوستان کے آدمی سراسر ناواقف ہیں۔ کالے پانی میں بھی ہر سال بہت سے آدمی اور کشتیاں سمندر کی نذر ہو جایا کرتی ہیں۔ اس بیس سال کی مدت میں مجھے بھی، بارہا ان آفات کا سامنا کرنا پڑا، مگر عین ڈوبنے کے وقت جب چاروں طرف سے ناامید ہو کر اللہ رب العزت کی طرف رجوع کرتا، تو وہ ربِّ قدیر مجھے فوراً بچالیتا تھا۔ ان بہت سی آفتوں میں سے جن میں یہ خاکسار وقتاً فوقتاً مبتلا ہو کر بچتا رہا، صرف تین واقعات کا اختصار کے ساتھ ذکر کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ میں روس سے جزیرہ پرسوپرنس بلیئیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ پرسوپرنس بلیئیٹ کے نزدیک پہنچ کر ایسا طوفان بادوباراں شروع ہوا کہ کشتی ڈگمگانے لگی اور ڈوبنے کے بالکل قریب تھی کہ موج کے ایک تھپیڑے نے اسے پل سنگ کے نزدیک کر دیا۔ اس وقت میں اور ایک دو دوسرے مسافر مستعدی سے پل پر کود پڑے۔ ابھی ہمارے پاؤں پل پر لگے ہی تھے کہ ایک موج نے کشتی کو اس زور سے دے مارا کہ کشتی ریزہ ریزہ ہوگئی اور مسافر سخت زخمی ہو گئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ ابرڈین سے روس جاتے وقت بھی بالکل اسی طرح کے حادثہ سے دوچار ہونا پڑا۔ اس حادثہ میں بھی موجیں کشتی کو پل پر دے مارنا چاہتی تھیں کہ ہم کود کر پل پر جا کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد کشتی پل سے ٹکرائی اور اس کے پرزے اڑ گئے، اکثر مسافر مجروح ہوئے اور بڑی مشکل سے ڈوبنے سے بچے۔

ایک تیسری مرتبہ ہماری کچہری کا سارا عملہ کشتی میں سوار ہو کر ابرڈین کو جا رہا تھا کہ عین وسط میں ایک سخت طوفان آیا کہ سب لوگ ناامید ہو گئے اور موت و حیات کی کش مکش میں بند سمجھنے لگے۔ بارش اور ہوا بھی بڑے زور سے تھی۔ نزدیک کوئی کنارہ تھا نہ فریادرس اندھیرا ایسا شدید تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اچانک کشتی کا مکان بھی ٹوٹ گیا اور کشتی پانی سے بھر گئی الغرض کوئی چارۂ کار ہی باقی نہ رہا اور سب راستے مسدود ہو گئے تو میں نے سوچا کیوں نہ اس فریادرس سے دادرسی کی جائے جو سب درماندہ لوگوں کے ٹوٹے ہوئے

داں کا سہارا ہے۔ میں نے اپنے خدا سے لو لگائی، میں نے اپنے آقا کے دروازے پر دستک دینا شروع کر دی، میں نے اپنے مولا کے سامنے دستِ سوال دراز کر دیا۔ ابھی دعا ختم نہ کی تھی کہ اچانک ہمارے پاس ایک بڑی کشتی نمودار ہوئی، جس میں سردار گمبیل سنگھ سپرنٹنڈنٹ پولیس سوار تھے۔ انہوں نے ہمیں اس تباہ حال صورت میں دیکھ کر جھٹ پٹ اپنی کشتی میں لے لیا اور اللہ کے فضل سے کشتی صحیح سلامت کنارے تک پہنچ گئی۔ اس واقعہ سے "اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ" کی ایسی تفسیر سمجھ میں آئی، جو آج تک کوئی واعظ، کوئی خطیب اور کوئی مفسر نہ سمجھا سکا۔

جنوری ۱۸۶۸ء میں خاکسار کا جزیرہ ہد دمیں تبادلہ ہو گیا اور وہاں اسٹیشن محرر مقرر ہو گیا ۲ر فروری ۱۸۶۸ء کو روس میں مولانا یحییٰ علی صاحب راہیٔ فردوس ہوئے۔ میں ان سے بہت فاصلہ پر جزیرہ ہد دمیں مقیم تھا، مجھے ان کی بیماری کی اطلاع بھی نہیں تھی مگر تقدیر عین اس وقت مجھے روس لے گئی جب ان کا جنازہ بالکل تیار تھا اور نماز پڑھنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ ہمارے مقدمے کے کئی آدمی ان کی تجہیز و تکفین میں شریک ہو گئے تھے۔

میری بیوی مولانا یحییٰ علی صاحب سے مرید تھی اور ان سے بہت محبت رکھتی تھی۔ اسے ان کی وفات سے بہت زیادہ صدمہ پہنچا؛ چنانچہ مولانا مرحوم کی وفات کے سوا دو مہینے بعد وہ نیک بخت بھی ۲۰ر اپریل ۱۸۶۸ء کو راہیٔ فردوس ہو گئی۔ میرا ہندوستان سے قید ہو کر جانا گویا اس بی بی کے خاتمہ بخیر کی تمہید تھا۔

### تجارت

اس بیوی کی وفات کے بعد میں نے سب زیور وغیرہ فروخت کر کے تین سو روپے دہلی میں اپنی بیوی کے پاس بھیج دیئے تاکہ وہ جوتے اور دیگر سامان خرید کر میرے پاس بھیج دے کیونکہ ان دنوں پورٹ بلیر میں دہلی کا مال تگنے چوگنے دام پر فروخت ہوتا تھا۔ مگر یہ مال زیادہ تر راستہ میں ضائع ہو گیا۔ دہلی سے روانہ ہونے کی تاریخ سے دو برس بعد گل سڑ کر تھوڑا سا مال ۱۸۷۰ء کو میرے پاس

پہنچا، جس سے مجھے صرف ایک سو پچاس روپے وصول ہوئے اور ایک سو پچاس روپے کا خسارہ ہوا۔

اس ایک صد و پچاس روپیہ کو بھی جب میں نے کلکتہ سے مال منگوانے کے لیے ایک دوست کے پاس بھیج دیا، تو بنگالی بابوؤں نے مخبری کر کے وہ ہنڈی پکڑوا دی کیونکہ سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے تجارت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے مال ایک سوداگر کے نام سے منگوایا تھا اور ہنڈی ایک ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی طرف سے مع طلب مال کے لیے خط میری طرف سے لکھا ہوا تھا۔ خط مع ہنڈی پکڑا گیا اور چیف کمشنر کے پاس پیش ہوا اور یہ میری سزا کے لیے کافی تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے اور ہنڈی دونوں کو بچا لیا۔ وہ سوداگر جس کے پاس ہنڈی بھیجی گئی تھی، رقم وصول کر کے کلکتہ سے فرار ہو گیا۔ الغرض اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ میں تجارت کروں۔ لہٰذا اس کے بعد کبھی تجارت کا ارادہ نہ کیا۔

## بیوی کا انتقال

اس بیوی کی وفات کے بعد دو برس تک مجرد رہا۔ جزیرۂ ہردوجہاں میری ملازمت اور قیام تھا، عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سی عورتوں نے مجھے شکار بھی کرنا چاہا مگر حفاظتِ غیبی شاملِ حال رہی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ہلاک نہ ہونے دیا۔ گو اپنے عہدہ کی وجہ سے رات دن مجھے ان فاحشوں سے ملنا پڑتا تھا اور طرح طرح کے سرکاری کام لینے پڑتے تھے کہ وہ اکثر میرے گھر بھی آتی جاتی تھیں اور مجھے شکار کرنے کی کوشش بھی کرتی تھیں لیکن جسے نگہدار رکھے اسے کون چکھے؟

میں نے یہ کیفیت دیکھی تو اپنی بیوی کو پانی پت سے پھر بلانا چاہا لیکن وہ راضی نہ ہوئی اور جب اس نے اپنی رضا کا اظہار کیا تو حاکمِ وقت نے میری درخواست نامنظور کر دی۔ اس لیے میں نے مجبوراً کسی نیک عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا اور بارگاہِ الٰہی میں التجا کی کہ اے اللہ جیسے تجھے پسند ہو، پردۂ غیب سے اس کا انتظام فرما دے اور کسی نیک بخت سے میرا سنجوگ کرا دے۔ ابتدا میں تو بعض دوستوں کے مشورہ سے یکے بعد دیگرے دو پنجابی مسلمان

عورتوں سے میرے نکاح کی بات چیت شروع ہوئی مگر طرفین کی رضامندی اور کسی ظاہری مانع کے نہ ہونے کے باوجود بات خود بخود موقوف ہوگئی۔ اس وقت تو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ بیل کیوں نہ منڈھے چڑھ سکی، لیکن بعد میں جب دوسرے دو آدمیوں سے ان کی شادی ہوئی، تو معلوم ہوا کہ وہ صحیح کردار کی مالک نہ تھیں۔ میں اس حفاظتِ غیبی پر شکرِ الٰہی بجا لایا۔

## دوسری شادی

ضلع المورہ کی برہمن قوم سے تعلق رکھنے والی ایک ہندو عورت ان دنوں نئی نئی قید ہو کر کالا پانی آئی اور ہدویں عورتوں کی بارک میں اسے رکھا گیا۔ وہ نہایت خوش چلن اور حیادار عورت تھی مگر ہندو دھرم میں نہایت متعصب کسی مسلمان عورت کے نزدیک کھڑا ہونا یا اس کے کپڑوں کو چھونا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ بارک کی مسلمان عورتیں تو اس کے تعصب کی وجہ سے تنگ آ گئی تھیں۔

میں نے ایک دن برسبیلِ تذکرہ اس سے کہا کہ اگر تو مسلمان ہو جائے تو دنیا و آخرت دونوں میں تیرے لیے یہ بہتر ہوگا اور دوزخ کی آگ سے بھی تجھے نجات مل جائے گی۔ میری بات سن کر اس نے نہایت حیرت کا اظہار کیا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ روزِ اوّل سے میرے بچوں کی والدہ ہونا، اس کے مقدر ہو چکا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ باوجودیکہ وہ کوہستان کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئی، جہاں اب بھی مسلمانوں کا نام و نشان نہیں لیکن وہ ہمیشہ شرک اور بت پرستی سے بیزار رہی، گو اسے بھی اس بیزاری کا سبب معلوم نہ تھا۔ اس کی وضع قطع اور عادات و اطوار کو دیکھ کر ایک جوتشی برہمن نے اس کی والدہ کو یہ کہہ دیا تھا کہ یہ لڑکی تم سے جلدی جدا ہو جائے گی۔

اپریل ۱۸۶۸ء میں جب میری کشمیری بیوی فوت ہوئی، انہی ایام کا تذکرہ ہے کہ اس برہمن عورت پر ایک ناگہانی مقدمہ ہو گیا، جس کے باعث یہ گرفتار ہو گئی۔ اسی اجمال کی مختصر سی تفصیل یہ ہے کہ ایک لڑکی میری اس ہونے والی بیوی کے ساتھ ایک بے آب کنوئیں کے قریب کھیل رہی تھی، اتفاق سے اس لڑکی کا پاؤں پھسلا اور وہ کنوئیں میں گر کر

سخت مجروح ہوگئی۔ اگرچہ اس میں میری بیوی کا قطعاً کوئی قصور نہیں تھا لیکن ان دونوں لڑکیوں کے والدین کے درمیان سخت عداوت تھی۔ لہٰذا انہوں نے اسی دیرینہ عداوت کی بناء پر اس بے گناہ پر اقدامِ قتل کا کیس کر دیا۔ قانونی طور پر یہ مقدمہ اگرچہ اس لائق تو نہ تھا کہ اسے حبسِ دوام کی سزا دی جائے، مگر اس حکیم و قدیر کو اسے میری بیوی بنانا منظور تھا، لہٰذا اسے اس جرم کی پاداش میں پورٹ بلیر پہنچا دیا۔

گرفتاری کی پہلی شب ہی تھی کہ اس نے بوقتِ سحر خواب میں ایک نورانی چہرہ بزرگ مسلمان کو دیکھا، جس نے اسے ٹھوکر مار کر کہا "اٹھو! نماز پڑھو اور دعا کرو، تمہارے لیے قید ہونا بہتر ہے۔" اس نے ایسی صورت کا کبھی کوئی انسان دیکھا تھا اور نہ نماز و دعا کے الفاظ سے آشنا تھی۔ گھبرا کر بیدار ہوگئی۔ محافظین میں سے ایک مسلمان سپاہی سے خواب بیان کر کے تعبیر پوچھی تو اس نے کہا کہ تو اس قید میں ضرور مسلمان ہو جائے گی۔

اس وقت یہ تعبیر اس کی طبع نازک پر نہایت گراں گزری اور اسے بالکل غیر ممکن معلوم ہوئی مگر قبولیت ازلی اور تعبیر رؤیائے حقہ کی بناء پر اس نے میری پیشکش کو قبول کر لیا اور مسلمان ہو کر میرے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہوگئی۔

اتفاق سے انہی دنوں رمضان المبارک جلوہ فگن ہوگیا۔ رمضان کی ۲۷ تاریخ کو میں نے بڑے دھوم دھام سے ایک تقریب کا اہتمام کیا اور اسے مسلمان بنالیا۔ جب اس نے ارکانِ اسلام اور نماز وغیرہ کے مسائل کو بخوبی سیکھ لیا تو میں نے حاکمِ وقت کو مطلع کر کے ۱۵ اپریل ۱۸۷۰ء کو اس سے شادی کر لی۔ صدہا آدمیوں نے اس تقریب سعید میں شرکت کی اور خوبیٔ قسمت کی بات یہ کہ حضرت مولانا احمد اللہ صاحب نے خطبہ نکاح پڑھا تھا۔ دوسرے دن بڑی شان و شوکت سے دعوتِ ولیمہ کا انتظام کیا گیا جس میں بہت سے احباب نے شرکت فرمائی۔

اس بیوی کے بطنِ اطہر سے اللہ تعالیٰ نے مجھے دس بچے عطا فرمائے، جن میں

سے آٹھ بچے اس وقت تک بقیدِ حیات ہیں۔ یہ بیوی پورٹ بلیر سے میرے ساتھ ہندستان بھی واپس آئی۔ اس نے گزشتہ بائیس برس نہایت حسنِ رفاقت، اطاعت اور عصمت کے ساتھ بسر کیے ہیں اور توحید و توکل میں بھی یہ بیوی لاثانی ہے۔

## چند خطوط

پورٹ بلیر پہنچ کر میں نے حاجی محمد شفیع صاحب انبالوی کو وقتاً فوقتاً چند خطوط بھی لکھے، جن میں آرام و آسائش کے ساتھ زندگی بسر کرنے، شادی اور ملازمت کا ذکر کیا تھا۔ کچھ خطوط ان لوگوں کو بھی بھیجے جو بے قصور مسلمانوں کو پھنسا کر نیم رہائی کی شکل میں ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہیں حسرت میں مبتلا کرنے کے لیے میں نے اپنی راحت اور تائیدِ الٰہی کا مبالغہ آمیز الفاظ میں ذکر کیا لیکن ان میں سے کسی خط کا بھی جواب نہ آیا۔

اسی اثناء میں مجھے معلوم ہوا کہ کسی نے سرکار کی خیر خواہی کے لیے، وہ خطوط گورنمنٹ ہند کو پہنچا دیئے اور ان پر خوب بحث ہوئی حتیٰ کہ سپرنٹنڈنٹ پورٹ بلیر سے بھی صحیح کیفیت کے متعلق استفسار کیا گیا۔ اگر اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا، حکام پورٹ بلیر میرے لیے بطور وکیل نہ جھگڑتے اور مراعات کا سلب کر لینا پورٹ بلیر کے قاعدۂ عام کے خلاف نہ ہوتا تو میرے لیے سخت مشقت کا حکم ہو جانا کچھ بعید نہ تھا۔ یہ اللہ کا خاص فضل ہی تو تھا، یا اس کی طرف سے تائیدِ غیبی ہی تو تھی کہ جان لارنس بہادر گورنر جنرل مجھ جیسے غریب قیدی سے سخت مشقت لینے کا متمنی ہو اور مجھے سزا بھی سخت مشقت تا حیات کی مل چکی ہو لیکن اللہ تعالیٰ ایسے سخت جھمیلوں کے باوجود مجھے سخت مشقت سے بچا لے۔

اللہ کی طرف سے ایک فضل یہ بھی تھا کہ جب ہم پورٹ بلیر پہنچے تو اس وقت یہاں کے سب حاکم مدراس کے تھے، وہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ اور وہابیوں کی بغاوت سے واقف نہ تھے، اس لیے ان کے دل صاف اور سینے خالی از تعصب تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ نہایت حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا بلکہ ہماری خوش چلنی، خوش اخلاقی اور عمدہ

کارگزاری کے باعث سنہ ۱۸۵۷ء کے دیگر قیدیوں کی نسبت زیادہ مراعات سے نوازا۔

جب پہلی مرتبہ ڈاکٹر ہنٹر نے مرچ نمک لگا کر ہمارے مقدمہ کو رسی سے سانپ اور رائی سے پہاڑ بنا کر پیش کیا اور لکھ دیا کہ وہابی اور باغی کے ایک ہی معنی ہیں اور بنگال کے صاحب لوگ اس جزیرہ میں آنے لگے، تو ہم آلام و مصائب کا تختۂ مشق بن گئے، راہ چلتے ہماری طرف اشارے کیے جاتے اور وہ ہمیشہ اس گھات میں رہتے کہ انہیں کب کوئی موقعہ ملے کہ قانونی حیلہ کی آڑ میں ایذا رسانی کے درپے ہو جائیں لیکن جب خدا تعالیٰ جیسے محافظ حقیقی کی حفاظت نصیب ہو تو کون ہے جو تکلیف پہنچا سکے۔ میں نے بارہا خدا کی نصرت کا مشاہدہ کیا کہ جب کوئی درپے تکلیف ہوا تو محافظ حقیقی نے مدد اور اعانت کا ایسا سامان کر دیا کہ دشمن منہ تکتے رہ گئے۔

## ایک جھوٹا مقدمہ

سپرنٹنڈنٹ کرنیل مین کے عہد میں ایک بڑے یورپین افسر کی تحریک سے میرے خلاف امانت تصرف بے جا کا جھوٹا مقدمہ کر دیا گیا، جس کی وجہ سے کرنیل مین جیسا بے تعصب حاکم بھی مجھ سے برافروختہ ہو گیا اور اس نے مجھے بذریعہ سمن فوراً عدالت میں طلب کر لیا۔ اس وقت بہت سے دوستوں نے مشورہ دیا کہ جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے لہٰذا تم لاعلمی کا اظہار کر کے اپنی جان بچالو۔ میں نے دوستوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا: "کچھ بھی ہو میں تو سچ بولوں گا۔"

جب مقدمہ پیش ہوا تو سب سے پہلے مجھے طلب کیا گیا اور کرنیل صاحب نے میرے بیانات قلمبند کرنا شروع کر دیئے۔ میں نے صحیح طور پر حرف بحرف بیان کر دیا کہ میرے سامنے مسٹر ہیوڈ اوورسیر مدعا علیہ نے مسمی حمید خاں جمعدار مدعی کی جائیداد جہاں جہاں پائی، بطور خود ضبط کر کے نیلام اور فروخت کر دی اور اس کا زرثمن خود کھا گیا۔ میں محرر اسٹیشن ہونے کی وجہ سے اس کے ہمراہ ضرور تھا ...... میرا بیان اس قدر رہا ہی تھا کہ مسٹر ہیوڈ سے تمام رقم حمید خاں مدعی کو دلا دی گئی اور ہیوڈ کو جو کہ چھ سو روپیہ ماہوار کا اوورسیر تھا ملازمت سے

برطرف کیے گئے ان جزائر سے بدر کر دیا گیا۔ میں اپنے سچ کی برکت سے صاف بری ہو کر گھر چلا آیا
انہی ایام یعنی جنوری ۱۸۶۹ء میں لیفٹیننٹ پرا تقرر ہوا۔ جو اس وقت کرنیل اور قائم
مقام چیف کمشنر پورٹ بلیر ہیں —— کالے پانی میں اسسٹنٹ ہو کر آئے تھے۔

## عید الاضحیٰ کے موقعہ پر جھگڑا

اپریل ۱۸۶۹ء میں جب عید الاضحیٰ آئی تو ہم نے ایک بیل خریدا اور دستور کے مطابق قربانی کا ارادہ کیا
مگر قربانی کے وقت باوہ کر کے ہندوؤں نے ہم سے بیل چھین لینا چاہا مگر ہمارے ساتھیوں نے
ان کے حملہ کو غیر واجبی قرار دیتے ہوئے بیل دینے سے انکار کر دیا۔ ہندو حسب عادت بڑے
جوش و خروش میں تھے۔ ہم نے عین اسی وقت بیل کو قربان کر دیا، سب ہندو بیل کی قربانی
کے ساتھ ہماری قربانی کرنے کے لیے ہمارے سروں پر تیغ ہو کر کھڑے تھے۔ ہم مسلمان صرف
چار پانچ تھے جب کہ ہندو دو سو سے بھی زیادہ تھے۔ اتنی قلیل جماعت کے لیے یہی قرین مصلحت
تھا کہ وہ اتنی کثیر اور پر جوش جماعت کا مقابلہ نہ کریں مگر مذہبی جوش اور ادائے فرض
نے ہمیں بھی مجبور کر دیا تھا۔ جب ہندوؤں کے سامنے بیل ذبح ہوا اور اس کی گردن سے خون
کے فوارے بہ نکلے تو انہوں نے بڑا بلوہ کیا اور شور و شغب کے ساتھ آسمان کو سر پر اٹھا لیا۔
ممکن تھا کہ دس بیس لاشے خاک و خون میں تڑپ جاتے مگر پولیس اور امدود میر کے جلد پہنچ جانے کے
باعث کشت و خون کی نوبت نہ پہنچی۔

## ہندوؤں کی سازشیں

مقدمہ کچہری میں چلنے لگا۔ ہندو بڑے مالدار، صاحب اقتدار اور حکام کے منہ چڑھے ہوئے تھے لیکن پرا تقرر
صاحب کی کوشش اور امداد سے ہم لوگ بچ گئے۔ میرے خیالات اور سمجھ بوجھ کی کیفیت جو
اب ہے اگر اس وقت بھی یہی ہوتی تو میں بیل کے بجائے بکرے کی قربانی کو ترجیح دیتا اور صد ہا
آدمیوں کے دلوں کو نہ دکھاتا ؎

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن　　　　کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

قربانی کے اس واقعہ کے بعد پورٹ بلیر کے سب ہندو آپس میں متفق ہو گئے کہ خواہ ہزاروں روپیہ خرچ ہو جائے ہم محمد جعفر کو سخت سزا دلا کر چھوڑیں گے۔ انہوں نے ساز باز کر کے مونگالال محرر کو جو میرے ماتحت تھا اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اسٹیشن کے حساب میں تغیر و تبدل کر کے میرے خلاف چوری اور غبن کا دعویٰ دائر کر دے؛ چنانچہ اس نے نیلام کے ایک حساب میں جو میری معرفت ہوا تھا، کمی بیشی کر کے سو روپیہ کا غبن میرے ذمہ لگا دیا۔ فارسی اور انگریزی دونوں حسابوں سے ان رقوم کی تصدیق کرا کے بہت سے گواہ بھی بنا لیے اگرچہ ضلع دار کو اس کی خفیہ رپورٹ ہو گئی تھی مگر ابھی تک مجھے اس کارروائی کا قطعاً علم نہ تھا۔

آخر کار ایک دن اوورسیر نے میرے گھر اچانک چھاپہ مارا اور سرکاری حساب کتاب سے متعلق تمام کتابیں اپنی گرفت میں لے لیں۔ میں نے سمجھا شاید میرے قتل کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ جب مجھے صحیح صورت حال کا علم ہوا اور پتہ چلا کہ دوسرے دن اس کیس کی تحقیق بھی ہو رہی ہے تو میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی زیر حراست کتابوں کو ایک گھنٹہ کے لیے حاصل کر کے اور اس ایک گھنٹہ میں جعلسازی کی اس کارروائی کو ملیامیٹ کر کے جو ایک مہینہ میں تیار ہوئی تھی، اپنا حساب ٹھیک کر دیا۔

دوسرے دن جزائر انڈمان کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پراتھرو صاحب کے زیر صدارت اجلاس میں تحقیقات شروع ہوئی۔ جب مدعیوں کی نشاندہی کے مطابق کتابوں میں حساب دیکھا گیا تو وہ بالکل درست نکلا اور اس میں سرمو فرق نہ تھا۔ پراتھرو صاحب چونکہ چند روز پہلے قربانی کے مقدمہ میں ہمیں بری کر چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ یہ مقدمہ اس قربانی والے مقدمہ کے باعث محض عداوت اور دروغ گوئی پر مبنی ہے۔ اس نے مونگالال کو چھ ماہ کی سخت قید اور ایک ہندو ریڈر کو ایک درجن کوڑوں کی سزا دی اور مجھے بری کر دیا۔

ہندو غصے سے لال پیلے ہو رہے تھے انہوں نے کورٹ میں کھڑے کھڑے مجھ پر ایک دوسرا الزام چوری کا بھی لگا دیا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مونگالال نے سزا پانے کے بعد

ہاتھ باندھ کر پراتھرو صاحب سے عرض کیا: "حضور کچھ میری عرض ہے" صاحب نے کہا: کہو! کیا ہے؟" اس نے کہا کہ حضور نے محمد جعفر کو بازار بنوانے کے لیے لکڑی کے جو سرخ تختے دیئے تھے، اس نے انہیں اپنے گھر میں استعمال کر لیا ہے اور ان سے گھر کے دروازے، تخت پوش اور صندوق بنوالیے ہیں اگر حضور اسی وقت تکلیف گوارا فرمائیں تو میں وہ سب چیزیں محمد جعفر کے گھر سے پکڑوا سکتا ہوں۔

مونگا جب یہ بیان دے رہا تھا تو میں سر جھکائے خداوند تعالیٰ سے دعا کر رہا تھا کہ اس آفت سے بچانا بھی تیرا ہی کام ہے۔ وہ سب چیزیں میرے گھر میں موجود تھیں اور اگر حاکم مجھ سے پوچھتا تو اثبات میں سر ہلانے کے سوا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مگر اس مقلب القلوب کی قدرتِ کاملہ کی کرشمہ سازی بغور سننے کے قابل ہے کہ مونگا کے جواب میں پراتھرو نے کہا کہ وہ تختہ تو ہم نے اسے دیا ہے۔ تمہیں مخبری کرنے کا کیا حق ہے۔ نکل جاؤ کم بخت میری عدالت سے اور مجھ سے فرمایا کہ تم گھر جاؤ اور آئندہ کے لیے ہوشیار رہو!

۱۸۷۹ء کا ذکر ہے کہ میرے گھر میں بدو اسٹیشن کے قیدیوں کی تنخواہ کا مبلغ پانچ سو روپیہ موجود تھا۔ ایک رات گھر کی کھڑکی توڑ کر ایک چور اندر گھس آیا، میرے پلنگ کے نیچے جلتی ہوئی بتی کو اس نے گل کر دیا، رقم ایک چھوٹے سے صندوقچہ میں تھی جو کہ میری پائینتی کے پاس رکھا ہوا تھا۔ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ میرا نوکر مراد بھی ایک دوسری کوٹھڑی میں سو رہا تھا الغرض چور کے راستہ میں کوئی چیز بھی مانع نہ تھی۔ وہ مال سمیٹ کر جانے کے لیے پر تول رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی، میں نے اندھیرا دیکھ کر اور کچھ آہٹ پا کر اپنے خادم مراد کو آوازیں دینا شروع کر دیا۔ چور خالی ہاتھ اور نامراد ہو کر فوراً بھاگ گیا اور اللہ رب العزت نے میری عزت رکھ لی اگر سرکاری روپیہ چوری ہو جاتا تو اس میں بظاہر سخت خرابی اور بربادی تھی۔

مارچ ۱۸۸۰ء میں میں نے ایک صد پچاس روپے کی ایک ہنڈی مسٹر اسٹراپ اکسٹرا

اسسٹنٹ کمشنر کی طرف سے منشی غلام نبی کے نام کلکتہ بھیجی تھی، جس کے ذریعے میں اپنی شادی کے لیے بعض ضروری سامان منگوانا چاہتا تھا اور وہاں بھی ایک دوسرے تاجر کے نام سے منگوانا تجویز کیا تھا کیونکہ میں سرکاری ملازم تھا۔ مجھے ہنڈی بھیجنے کا اختیار تھا نہ مال منگوانے کا۔ یہ سب ناجائز کارروائی مخفی طور پر کی جا رہی تھی۔

جب میں نے خط مع ہنڈی ڈاک میں ڈالا تو میرے دشمن ہندوؤں کو بھی کسی ذریعے سے اس کی خبر ہو گئی۔ انہوں نے کرنیل مین چیف کمشنر کو مخبری کر کے اس خط اور ہنڈی کو پکڑوا دیا اور ان کا منصوبہ یہ تھا کہ ہنڈی کی ضبطی کے علاوہ مجھے سزا بھی دلائی جائے۔ مجھے جب خط اور ہنڈی کے پکڑے جانے کا علم ہوا تو میں نے فوراً اپنے خدا کے دروازے پر دستک دی اور عرض کیا کہ اے اللہ! اس مشکل سے نجات بھی تو ہی دے سکتا ہے۔ دعا کے بعد پادری اقرو صاحب کے پاس گیا اور میں نے سارا حال کہہ سنایا اور کہا کہ یہ بھی درحقیقت اسی قربانی والے واقعہ کی وجہ سے عداوت کا نتیجہ ہے۔ پادری صاحب نے کہا: فکر نہ کرو میں کرنیل مین سے ملاقات کر کے صورت حال دریافت کروں گا۔ الغرض پادری صاحب کرنیل مین کی کوٹھی پر گئے اور ان سے ملاقات کر کے میری ہنڈی اور خط دونوں واپس لے آئے اور مجھے دے دیے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہندو تمہارے دشمن ہیں، تم ہوشیار اور چوکنا رہا کرو۔

## مولانا محمد حسن انڈمان میں

اگست ۱۸۶۶ء میں میرا جزیرہ چاتھم سے روس تبادلہ ہو گیا۔ مئی ۱۸۷۲ء کو جب میں جزیرہ روس ہی میں تھا محمد حسن صاحب ہماری ملاقات کے لیے چیتھم سے پورٹ بلیئر آئے اور ایک جمعہ رہ کر واپس وطن تشریف لے گئے۔

ایک دن جب مولانا بڑے ذوق شوق سے کشتی میں سوار ہو کر مولانا احمد اللہ صاحب کی ملاقات کے لیے جزیرے سے ... جا رہے تھے تو راستے میں کشتی طوفانِ باد و باراں میں پھنس گئی۔ قریب تھا کہ گرداب میں ڈگمگاتے ہوئے ڈوب جائے۔ مولانا کو کشتی کے ڈوبنے

کی بجائے زیادہ افسوس یہ تھا کہ مولانا احمد اللہ صاحب کی زیارت نصیب نہ ہو سکے گی۔ لیکن یہ فقط آزمائش تھی۔ چند جھونکوں کے بعد طوفان تھم گیا اور مولانا بخیریت دیسر پہنچ گئے اور مولانا احمد اللہ صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔

ہماری گرفتاری کے بعد انگریزوں نے مولانا محمد حسن کو بھی پھنسا کر کالے پانی بھیجنا چاہا تھا مگر اللہ کے فضل سے وہ محفوظ رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح بھی کالے پانی بھیج کر اور مصائبِ بحری میں مبتلا کر کے اسیرانِ کالا پانی کے اجر و ثواب میں شریک کر دیا۔

مارچ ۱۸۷۱ء میں چیف کمشنر کرنیل مین ریٹائرڈ ہو گئے اور وہ پنشن پا کر ولایت چلے گئے۔ اکتوبر ۱۸۷۱ء میں جنرل اسٹوارٹ ——— جو آخر میں ہندوستان کے جنگی لاٹ بھی ہو گئے تھے ——— چیف کمشنر بن کر انڈمان آئے۔ اسی کے عہد میں لارڈ میو صاحب بہادر کے حکم سے پورٹ بلیر کے قیدیوں کے لیے بھنڈار کا کھانا مقرر ہوا اور لارڈ میو کا بنایا ہوا وہ قانون بھی جاری ہوا، جس کے باعث پورٹ بلیر کی قید ہندوستان اور ولایت کے جیل خانوں سے بھی زیادہ سخت ہو گئی۔

## لارڈ میو انڈمان میں

اسی سپرنٹنڈنٹ کے عہد میں ۸ / فروری ۱۸۷۲ء کو ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ میو قتل کیے گئے۔ اس کی مختصر سی تفصیل یہ کہ ۸ / فروری ۱۸۷۲ء کو لارڈ میو سات بجے کے بعد چار اگنبوٹوں میں جزیرہ انڈمان آئے۔ لارڈ صاحب کے ساتھ صدہا یورپین مرد عورتیں تھیں، جو ان جزائر کی سیر و سیاحت کے لیے آئی تھیں۔ ۸ بجے کے بعد گورنر صاحب اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ پورٹ بلیر کے صدر مقام جزیرہ روس کی طرف چل پڑے۔ جب روس پہنچے تو انہیں ۲۱ توپوں کی سلامی دی گئی۔ جب سلامی جا رہی تھی تو جزیرہ کے گھاٹ پر ہزاروں مرد عورتیں، آزاد اور قیدی اس منظر کو دیکھنے کے لیے موجود تھے۔ لارڈ صاحب ٹاپو سے اُترنے کے فوراً بعد روس کے بازار آئی لینڈ کی طرف متوجہ ہو گئے اور بازار، سکول، ہسپتال، قیدیوں کی بارکیں اور جنگی پلٹن کی بارکیں دیکھنے کے بعد انڈمان کے

چیف کمشنر کے بنگلہ پر چلے گئے۔ وہاں کھانے پینے اور تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد گورا بارک دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ پھر اپنے اگنبوٹ کو دیکھتے ہوئے دیپر چلے گئے، جہاں بدمعاش قیدیوں کو رکھا جاتا ہے، دیپر کے ملاحظہ کے بعد جزیرہ چاٹم میں چلے گئے۔

جزیرہ چاٹم، روس اور دیپر کے درمیان مونٹ ہریٹ کے قریب واقع ہے۔ یہاں ایک دخانی آرہ گھر بھی ہے۔ لارڈ صاحب نے یہاں سُرخ لکڑی کے ایک تختہ کو بہت پسند کیا۔ چاٹم کی سیر کرتے کرتے لارڈ صاحب کے دل میں آیا کہ مونٹ ہریٹ کو بھی ملاحظہ کرنا چاہیئے۔ وقت نامناسب ہونے کی وجہ سے پرائیویٹ سیکرٹری اور چیف کمشنر نے بڑے اصرار سے کہا کہ آج مونٹ ہریٹ نہیں جانا چاہیئے لیکن لارڈ صاحب نہ مانے بلکہ صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ موت نے انہیں نہ ماننے دیا۔

## لارڈ میو کا قتل

چاٹم سے سوار ہو کر جب ہوپ ٹون پہنچے، جو کوہ ہریٹ کے زیریں علاقے میں آباد ہے، تو وہاں شیر علی ایک آفریدی قیدی چھری لیے ہوئے مدتِ دراز سے اس انتظار میں کھڑا تھا کہ کب یہاں سے کسی افسر کا گزر ہو اور وہ اسے چھری کا نشانہ بنا کر آتشِ انتقام کو سرد کرے۔ جب لارڈ صاحب کی کشتی ہوپ ٹون پہنچی تو وہ بھی اپنی چھری چھپائے ہوئے ان کے ہمراہ ہو گیا۔ راستہ میں اس کا کوئی داؤ نہ چلا اور لارڈ صاحب خیریت کے ساتھ پہاڑ پر پہنچ گئے۔ غروبِ آفتاب کا وقت قریب تھا۔ لارڈ میو صاحب نے وہاں جیٹھ کر سمندر میں غروبِ آفتاب کا نظارہ دیکھا اور کہا کہ ایسا خوبصورت منظر میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا تھا۔ جب کافی اندھیرا چھا گیا تو مشعلوں کی روشنی میں نیچے اترنے لگے۔ اس وقت چاروں طرف پولیس کا مسلح پہرہ تھا، چیف کمشنر، پرائیویٹ سیکرٹری بدن سے بدن ملائے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ علاوہ ازیں دوسرے بیسیوں افسر بھی ان کے آگے پیچھے چل رہے تھے اور لارڈ صاحب خیریت سے ہوپ ٹون کے گھاٹ تک پہنچ گئے۔ جب گھاٹ کے قریب کھڑی ہوئی گاڑی کے نزدیک پہنچے، تو چیف کمشنر اجازت لے کر کسی ضرورت کی وجہ سے پیچھے چلے گئے۔ لارڈ صاحب

اور پرائیویٹ سیکرٹری خراماں خراماں جا رہے تھے۔ جب گاڑی کے قریب پہنچے تو شیر کی طرح کود کر اس نے لارڈ صاحب کو چھری سے دو ایسے کاری ضرب لگائے کہ وہ لڑکھڑا کر سمندر میں جا گرے۔ اس گڑبڑ میں تمام مشعلیں بھی گل ہو گئیں لیکن ایک دوسرے قیدی نے جرأت سے کام لیتے ہوئے قاتل کو پکڑ لیا ورنہ وہ شاید دو چار اور کو بھی زخمی کرتا۔ لارڈ صاحب کو سمندر سے نکال اسی گاڑی پر لٹا دیا گیا، بمشکل سے ایک دو باتیں ہی کرنے پائے تھے کہ راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔

## شیر علی، تختہ دار پر

قاتل سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ اقدام کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا: "خدا کے حکم سے۔" پھر پوچھا گیا کہ کیا تمہارا کوئی اور بھی شریک ہے؟ "خدا میرا شریک ہے۔" اس کا جواب تھا۔ تحقیقات کے بعد بنگال ہائی کورٹ کے فیصلہ کے مطابق قاتل کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

قاتل شیر علی ضلع پشاور کا افغان تھا۔ اس نے بتایا کہ ۱۸۶۹ء سے میرا ارادہ تھا کہ کسی بڑے انگریز افسر کو ماروں گا۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر میں نے کئی سال سے یہ چھرا تیار کر رکھا تھا۔ ۸ر فروری ۱۸۷۲ء کو جب لارڈ صاحب آئے اور انہیں توپوں کی سلامی دی گئی تو میں نے چھرے کو دوبارہ تیز کیا اور سارا دن تاک میں رہا کہ کب اس ٹاپو میں پہنچوں جس میں لارڈ صاحب مجھے ملیں۔ مگر مجھے رخصت نہ ملی۔ شام کے وقت جب میں مایوس ہو گیا تو تقدیر لارڈ صاحب کو میرے گھر لے آئی۔ پہاڑ پر بھی لارڈ صاحب کے ساتھ گیا تھا اور ساتھ ہی واپس آیا لیکن کہیں موقع میسر نہ آسکا۔ پھر میں گاڑی کی آڑ میں آکر چھپ گیا اور یہاں میری دلی مراد پوری ہو گئی۔

یہ شخص گو ضعیف الجثہ، پست قد اور بدصورت تھا لیکن بڑا شہ زور اور دلیر تھا۔ تختہ دار پر لٹکتے وقت بالکل ہراساں نہ تھا بلکہ بآوازِ بلند قیدیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: "بھائیو! میں نے تمہارے دشمن کو مار دیا ہے، تم گواہ رہو کہ میں مسلمان ہوں"، پھر وہ کلمہ پڑھنے لگا اور کلمہ پڑھتے پڑھتے ہی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

اس ادنیٰ درجہ کے قیدی کے ہاتھوں لارڈ صاحب کا قتل قدرتِ الٰہی کا ایک نمونہ

تھا ورنہ کہاں گنگو تیلی اور کہاں راجہ بھوج ۔ جب پیام اجل آپہنچا تو یہ صدہا محافظ مسلح پولیس اور حفاظت کا دیگر ان گنت سامان کچھ کام نہ آیا۔ وہ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے، اس کی قدرت میں کسی کو دخل نہیں۔

اس واقعہ سے ایک ماہ قبل ایک اور پشاوری افغان نے چیف جسٹس نارمن کو اسی طرح کلکتہ میں چھرے سے قتل کر دیا تھا۔ اب چاہیئے تو یہ تھا کہ ان وحشت ناک اور عبرت انگیز واقعات کے بعد انگریز پٹھانوں کے دشمن ہو جاتے لیکن مَیں نے دیکھا کہ صاحب لوگ پہلے کی نسبت انگریزوں کی دو چند خاطرداری کرنے لگ گئے اور پٹھانوں کے بجائے بدنصیب وہابیوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنانے لگ گئے۔ آہ! مارنے والے سے ہر کوئی ڈرتا ہے اور غریب پر ہر کوئی شیر ہو جاتا ہے۔

## ایشری پرشاد کی سازش

اس سے زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ لارڈ صاحب کے اس قتل کے بعد ملیٹ صاحب کمشنر پولیس کلکتہ اور لالہ ایشری پرشاد ـــــ ہمارے پرانے دوست جو ہم پر الزام لگا کر سارجنٹ سے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے ـــــ اور چند نامی گرامی پولیس افسر ہندوستان سے یہ عزم لے کر پورٹ بلیر پہنچے کہ ہم اس مرتبہ وہابیوں کو ضرور پھنسا دیں گے لیکن اللہ کے فضل سے اس وقت پورٹ بلیر میں جنرل اسٹوارٹ اور پرائتھر ایسے ہوشیار اور بیدار مغز افسر موجود تھے، جو ہمارے حالات، چال چلن، اس قتل کی کیفیت اور قاتل کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ اس وجہ سے اس مرتبہ ایشری پرشاد کو ناکام واپس لوٹنا پڑا ورنہ اس نے آتے ہی جھوٹے گواہ بنانا شروع کر دیئے۔ جنرل اسٹوارٹ کو جب معلوم ہوا تو اس نے کہا ہم ان وہابیوں سے بخوبی واقف ہیں لہٰذا جھوٹی شہادتوں پر مبنی ایسی ناجائز کارروائی اپنے علاقے میں ہم ہرگز ہرگز نہ ہونے دیں گے۔ اللہ رب العزت نے اس ناگہانی آفت سے محفوظ رکھا اور اصل مجرم ہی سزایاب ہوا۔

## انگریزی زبان کی تعلیم

لارڈ میو کے قتل تک میں انگریزی زبان سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ ۱۸۷۲ء میں ایک انگریزی خواں لام سروپ کی ترغیب

سے میں نے انگریزی زبان سیکھنی شروع کر دی تھی اور ایک سال کی محنت ہی سے مجھے لکھنے، پڑھنے اور بولنے میں خوب مہارت ہوگئی تھی۔ فرصت کے لمحات میں لوگوں کو اُردو، فارسی اور ناگری زبانیں سکھایا کرتا تھا، یہی وجہ تھی کہ ان سے کثرتِ اختلاط کے باعث میری انگریزی کی استعداد بہت بڑھ گئی۔ اس وقت وہاں کاتبوں کی قلت تھی لہٰذا سرکاری ملازموں کو عرائض نویسی اور اپیل نویسی وغیرہ کی بھی ممانعت نہ تھی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے بھی عرضی و اپیل نویسی کا شغل جاری رکھا اور جب انگریزی میں لکھنے کی استعداد پیدا ہوگئی تھی، تب سے انگریزی میں لکھنا شروع کر دیا تھا، اس سے علمی استعداد میں ترقی کے علاوہ ہزاروں روپے کا مادی فائدہ بھی ہوا۔

چنانچہ انگریزوں کی معلمی اور عرائض نویسی سے سو روپیہ ماہوار بخوبی کما لیتا تھا۔ کالا پانی میں میرے علاوہ اور کوئی مسلمان انگریزی خواں نہ تھا، اس لیے میں نے اس علم کی بدولت مسلمانوں کے بعض بڑے بڑے اہم مقدمات میں ان کی بہت مدد کی، بڑی بڑی آفتیں اور مصیبتیں دُور کرائیں اور بہت نفع پہنچایا، جسے مُدّت مدید اور عرصہ بعید تک فراموش نہ کیا جاسکے گا۔ میری انگریزی دانی کی وجہ سے جن کی پھانسی موقوف ہوگئی اور جان بچ گئی، وہ تو تازیست اس احسان کو نہ بھولیں گے۔ یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ جس دن میری رہائی کا حکم پہنچ کر مشہور ہوا، اسی دن سے سرکاری ملازموں کے لیے عرائض نویسی کی قطعی طور پر ممانعت ہوگئی اور اب تو یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ اگر کوئی سرکاری ملازم بھول کر بھی عرضی لکھ دیتا تو اُسے ملازمت سے فوراً برخاست کر دیا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی دیگر نوازشات کی طرح یہ اجازت بھی خاص میرے ہی لیے تھی۔

انگریزی سیکھ کر میں نے بڑے بڑے کتب خانوں کی سیر کی، ہر علم و ہنر کی صدہا کتابوں کا مطالعہ کیا، دُنیا کی کوئی زبان ایسی نہ ہوگی جس کی صرف و نحو انگریزوں نے نہ لکھی ہو، کوئی ملک نہ ہوگا جس کی تاریخ نہایت شرح و بسط کے ساتھ انگریزی میں نہ ہو۔ انگریزی زبان علوم فنون کا سرچشمہ ہے۔ جو یہ زبان نہیں جانتا وہ حالاتِ دُنیا سے بخوبی واقف نہیں ہوسکتا، اس زبان کے داخل کرنے کے لیے آج کوئی آلہ زر نہیں ہے۔

جس طرح یہ زبان دُنیوی فوائد کے لیے نہایت مفید ہے، اسی طرح دین کے لیے مضر بلکہ سمِ قاتل ہے۔ کوئی جوان لڑکا جس نے پہلے قرآن و حدیث اور سلوکِ راہِ نبوت میں مہارت حاصل نہ کی ہو، وہ انگریزی زبان سیکھ کر مختلف علوم و فنون کا مطالعہ کرے تو پرلے درجے کا بے حد آزاد، بے دین، بے ادب اور ملحد ہو جائے گا۔ بلکہ ایسا بے دین اور ملحد ہو گا کہ پھر اس کا سنورنا محال ہی نہیں ناممکن ہو گا۔

## مغربی علوم کا ملحدانہ اثر

صرف انگریزی زبان کا سیکھنا مضر نہیں بلکہ مضر رساں بات یہ ہے کہ علوم و فنون کی ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے، جو انبیاء کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ خصوصاً جو لوگ اصولِ دین کی واقفیت نہیں رکھتے ان کے دل میں تو مغربی علوم و فنون کے مطالعہ سے تشکیک کے ایسے کانٹے پیدا ہو جاتے ہیں جو کبھی نہیں نکل سکتے۔ اس مرض یا دل کی موت کے باعث عبادت سے بھی بہت غافل ہو جاتے ہیں۔ گو ظاہری طور پر اسلام کے لاکھ دعوے کریں لیکن درحقیقت وہ اسلام سے منہ موڑ چکے ہوتے ہیں۔ میرا اپنا حال کچھ اس طرح کا ہو گیا کہ میری نماز تہجد یک قلم چھوٹ گئی حالانکہ یہ بچپن سے میرا معمول تھا۔ رات کو معمول کے مطابق بیدار تو ہو جاتا لیکن دو بجے سے فجر تک چارپائی پر بیٹھا رہتا، ہمت نہ پڑتی کہ وضو کر کے نماز شروع کر دوں۔ اسی طرح جمعہ اور باجماعت نماز ادا کرنے میں بھی غفلت کا شکار ہونے لگا حتیٰ کہ قرآن و حدیث کے پڑھنے اور سننے کا بھی وہ شوق نہ رہا جو کبھی تھا۔ رمضان المبارک میں بھی قرآن مجید کی تلاوت بہت گراں گزرنے لگی۔ ایک وقت تھا کہ ہاتھ اٹھا کر گھنٹوں دعائیں مانگا کرتا تھا مگر اب کیفیت یہ ہو گئی کہ چار کلمے بھی زبان سے نہ نکلتے کہ ہاتھ خود بخود نیچے گر جاتے۔ فرض نماز پنجگانہ ادا تو کرتا تھا مگر یہ کام مجھے پہاڑ سے بھی زیادہ سخت معلوم ہوتا۔ قریب تھا کہ میں فرض نماز روزہ کو بھی جواب دے دوں۔ ان کے عبث ہونے اور ترک کر دینے کے دلائل بھی شیطان نے مجھے سکھانے شروع کر دیئے تھے۔

قرآن مجید کے تین پارے مجھے حفظ تھے، ان میں سے آخری چند سورتیں یاد رہ گئیں باقی

سب بھول گیا۔ صد ہا حدیثیں یاد تھیں وہ بھی گویا دل سے کسی نے دھو ڈالیں۔ ان بُرے عقائد و اعمال سے میرے دل پر زنگ لگنا شروع ہو گیا حتیٰ کہ میرا دل مریض ہو گیا اور پھر تو نوبت بایں جا رسید کہ دل پر نزع کی کیفیت طاری ہو گئی اور قریب تھا کہ دل مردہ ہو جائے اور اس پر طرہ یہ کہ اس حالت میں شیطان میرے دل میں ایسی ایسی وجوہات منقش کرتا، جن کی وجہ سے میں اپنی اس حالت کو سب سے بہتر جانتا اور سمجھتا تھا کہ جنت میں جانے کے لیے صرف کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کافی ہے اور یہ سب تکالیف شرعیہ بے فائدہ ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ گاہے گاہے حق تعالیٰ کی طرف سے شیطان کی ان سازشوں کے متعلق بھی مجھے القا کیا جاتا لیکن اس کے باوجود دل ملحدوں اور دہریوں کے دلائل کی طرف مائل ہو جاتا تھا الغرض مجھ میں اور کفر میں صرف چند انگشت کا فرق باقی رہ گیا تھا۔ یہ کیفیت ایک دو دن نہیں بلکہ عرصۂ دراز تک رہی۔ شاید سابقہ اعمالِ صالحہ کا اثر تھا کہ مجھے اپنی اس ہلاکت آفریں کیفیت کا احساس ضرور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ احساس جب شدت اختیار کر جاتا تو میرے منہ سے بے اختیار دعائیں بھی نکلتی تھیں کہ "اے آنکھ والے! مجھ اندھے کا ہاتھ پکڑ۔"

آخر کار اللہ کی رحمت کا دریا جوش میں آیا اور میری توبہ کے سامان فراہم ہو گئے۔ ہوا یہ کہ غالباً دسمبر ۱۸۹۰ء میں ایک شدید دنبل کے عارضہ میں مبتلا ہو کر سخت بیمار پڑ گیا، جس کے باعث سب کھانا پینا بھی چھوٹ گیا۔ ڈیڑھ مہینے تک اس دنبل سے سیروں پیپ جاری رہی، پانچ ہفتے تک ہسپتال میں پڑا رہا، مرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہ گیا تھا، دوست آشنا سب مایوس ہو گئے اس حالت میں میں نے گڑگڑا کر اللہ کے دروازے پر دستک دی اور اپنی حالت سے منفعل ہو کر سچی توبہ کی اور عہد کیا کہ اس بیماری سے شفا پاتے ہی نماز تہجد شروع کر دوں گا اور قرآن و حدیث کا مطالعہ بھی کیا کروں گا۔

مجھے اسی وقت سے قبولیت دعا کے آثار نظر آنے لگے، دل کی حالت پلٹ گئی اور اللہ کی رحمت کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آنے لگا۔ بھولا ہوا قرآن و حدیث اور ادعیہ ماثورہ یاد آنے لگیں،

نماز اور دعا میں بھی لذت و حلاوت محسوس ہونے لگی ۔ اس کیفیت کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہ بیماری تو محض میری اصلاح اور تربیت کے لیے تھی ہسپتال سے واپس آکر پھر از سرِ نو قرآن و حدیث کا مطالعہ شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں میری حالت پہلے سے بھی اچھی ہو گئی ۔

مَیں نے محسوس کیا کہ جس قرآن و حدیث کے پڑھنے سے طبیعت گھبراتی اور ثقیل ہوتی تھی اور ایک دو آیت پڑھنا بھی محال اور دشوار ہوتا تھا ، اب دن بھر بیٹھ کر پڑھتا ہوں اور اس سے طبیعت کو سرور اور دل کو لذت نصیب ہوتی ہے اور وہ دعا جس کے لیے ہاتھ اٹھانا محال تھا ، اب گھنٹوں مانگنے سے بھی سیر نہیں ہوتا ۔ اس کیفیت میں مجھ پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ عبادت اور اطاعت کی توفیق دینا بھی اللہ کا فضل ہے ، جس کو چاہے دے ، جس کو چاہے نہ دے ۔

## مجاہدین اور سرکار ہند

مجاہدین کے خلاف سرکارِ ہند کی پالیسی نہایت معاندانہ تھی ۔ ۱۸۶۳ء میں وہابیوں کی گرفتاری کی جو آگ تھانیسر میں روشن ہوئی تھی ، وہ تیز ہوتی گئی اور ہر طلوع ہونے والا سورج اس کی تیزی کا پیام لے کر اُفق پر نمودار ہوتا ہمارے ہندو اور بعض مسلمان بھائی اس آگ کو بجھانے کے بجائے اس میں تیل اور تارپین ڈال کر بڑھاتے گئے ۔ آخر کار ڈاکٹر ہنٹر نے اس جلتی ہوئی آگ پر ہزاروں من ولایتی بارود اور مٹی کا تیل ڈال دیا[1] اور ہماری سرکار کو یہاں تک بھڑکایا کہ اس نے صادق پور پٹنہ کے وہابیوں کے ان مکانات کو نہ صرف پیوند زمین کر دیا بلکہ زمین سے ان کی بنیادوں کو کھدوا کر دور پھنکوا دیا ، جن میں اس قافلۂ حریت کے لوگ ٹھہرا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی سرکار کی آتشِ انتقام سرد نہ ہوئی[2] ۔

---

[1] ڈاکٹر ہنٹر کی رسوائے زمانہ کتاب OUR INDIAN MUSLMANS کی طرف اشارہ ہے ، جس میں اس نے شرافت اور انسانیت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مجاہدین کے خلاف نہایت بے سروپا باتیں لکھیں ، جن سے مشتعل ہو کر انگریزوں نے مجاہدین کو آلام و مصائب کا اس قدر تختۂ مشق بنایا کہ الامان والحفیظ

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے مولانا عبدالرحیم مرحوم کی کتاب "تذکرہ صادقہ" ، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک"

## پٹنہ اور بنگال میں گرفتاریاں

۱۸۶۳ء کے آخر تک پٹنہ اور بنگال میں بے گناہوں کی گرفتاری کا سلسلہ جاری رہا۔ امیر خاں سوداگر چرم اور مولوی تبارک علی کے علاوہ دیگر بے شمار آدمی پٹنہ میں دھر لیے گئے۔ مولوی امیر الدین صاحب کو پنجرہ اور ایک بوڑھے شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور سے گرفتار کرایا گیا اور اپنے معمولی اور بِکے ہوئے گواہوں سے اپنی مرضی کے مطابق شہادت حاصل کرکے، ان بے چارے مظلوموں کو سُوئے کالا پانی روانہ کر دیا گیا۔

حکومت نے اپنا تمام خرچ امیر خاں کی جائیداد فروخت کرکے حاصل کر لیا۔ اگرچہ اسے بھی حبسِ دوام کی سزا دی گئی تھی لیکن چار سال بعد مفت کا احسان کرکے اسے چھوڑ دیا اور اس غریب کی ضبط کی ہوئی جائیداد میں سے ایک پائی بھی اسے واپس نہ کی۔ ذرا غور فرمائیے کہ اگر امیر خاں اتنا بھاری مجرم تھا جیسا کہ مقدمہ کی مثل ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے تو اسے چار برس بعد کیوں رہا کر دیا گیا؟ اور اگر وہ قصور وار نہیں تھا جیسا کہ اس کی رہائی سے معلوم ہوتا ہے، تو اتنے شدید اہتمام سے اس غریب کی جائیداد فروخت کرنے اور اسے پابندِ زنجیر و سلاسل کرنے کا کیا جواز تھا؟

مارچ ۱۸۶۷ء میں مولوی تبارک علی صاحب[1] اور مولوی امیر الدین صاحب ہمارے پاس کالا پانی پہنچ گئے۔ قانونِ جدید کے جاری ہونے کی وجہ سے ان بے چاروں کو ایک مدت تک سخت مشقت کرنا پڑی۔ پھر اللہ کا فضل ہوا اور مولوی تبارک علی صاحب اسٹیشن محرر اور مولوی

---

[1] مولوی تبارک علی بن مولوی مبارک علی دونوں باپ بیٹے تحریکِ جہاد میں کام کرنے کے اعتبار سے شعلہ جوالہ سے کم نہ تھے۔ مولوی تبارک علی صاحب پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے جنگ امبیلہ میں مولانا عبداللہ صاحب کے ساتھ شرکت کی اور ایک دستے کی کمان بھی کی۔ ۱۸۶۵ء میں آپ کو حبسِ دوام بعبور دریائے شور اور ضبطیِ جائیداد کی سزا دی گئی اور ۱۸۸۳ء میں رہائی ہوئی۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۵۹۔

امیرالدین صاحب معلم مدرسہ مقرر ہو گئے ۔ دس برس قید کاٹنے کے بعد لارڈ رپن کے حکم سے ہمارے ساتھ ہی رہا ہو گئے گو ایام قید کم تھے لیکن مشقت کی سختی کی وجہ سے گویا ہمارے برابر ہو گئے تھے۔

جب دس برس تک بھی وہابیوں کی قید و بند کا یہ سلسلہ بند نہ ہوا، تو میں اپنے بُرے اعمال کو یاد کر کے بہت کُڑھا کرتا تھا کہ یہ آگ میرے گھر سے نکلی اور میری بداعمالیوں کی وجہ سے دس برس تک تمام ہندوستان میں جلتی رہی اور ہزارہا علماء و شرفاء اس مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ اے کاش! مجھ سا منحوس اور بدبخت پیدا نہ ہوتا یا بچپن ہی میں مرجاتا تو مسلمانوں پر یہ آفت نہ ٹوٹتی ؎

چو از قومے یکے بیدانشی کرد
نہ کہہ را منزلت ماند نہ مہ را

مارچ ۱۸۷۲ء میں جس جہاز میں مولوی تبارک علی اور مولوی امیرالدین آئے تھے، اسی جہاز سے میاں عبدالغفار[1] کی بیوی اور دو بچے بھی بحکم سرکار کالاپانی پہنچے۔ میاں عبدالغفار نے چیف کمشنر پورٹ بلیر کے ذریعہ گورنمنٹ سے درخواست کی تھی کہ ان کے بیوی اور بچوں کو ہندوستان سے بلا دیا جائے۔ گورنمنٹ بنگال شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے ایسے "باغی" کے بیوی بچوں کو اپنے خرچ پر کالاپانی بھیج دیا۔

اتنے شدید غیظ و غضب سے مسلسل دس برس تک وہابیوں کے دھڑا دھڑ گرفتار کر کے دریا بُرد کرنے سے انگریزی سرکار کا مقصد یہ تھا کہ ان فرزندانِ توحید کا ہندوستان کی سرزمین سے قلع قمع کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انھیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے لیکن جسے خدا رکھے اسے کون چکھے میں نے کالاپانی سے واپس آکر دیکھا کہ جب میں ہندوستان سے رخصت ہوا تھا تو سارے پنجاب میں وہابی عقیدے کے دس مسلمان بھی نہ تھے لیکن اب دیکھتا ہوں کہ پنجاب کا کوئی

---

[1] میاں عبدالغفار ولد نگل صادق پور کے باشندے تھے۔ مولانا احمد اللہ یا مولانا عبدالرحیم کے ملازم تحریک کے نہایت پُرجوش اور مخلص کارکن تھے۔ ۲۵ برس کی عمر میں کالاپانی پہنچے اور ۳۵ برس کی عمر میں رہائی ہوئی۔ ۱۹۱۲ء کے قریب راہگرائے عالمِ جاوداں ہو گئے۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۳۲۔

شہر، قصبہ اور گاؤں ایسا نہیں جس میں چوتھائی حصہ وہابی نہ ہوں۔ جو امام محمد اسمٰعیل شہید[1] رحمہ اللہ کے معتقد ہیں اور یوماً فیوماً دیوانوں اور فرزانوں کی یہ جماعت ترقی کر رہی ہے۔ یورپ میں پراٹسٹنٹ فرقہ پر جب عتاب نازل ہوا تو کوئی عذاب، شکنجہ، سُولی، پھانسی، جلا وطنی اور آگ ان کے راستہ میں رکاوٹ نہ بنی۔ یہی کیفیت یہاں تھی۔ تجربہ سے ثابت ہے کہ کسی فرقہ کی ترقی کو روکنا اور اس پر تشدّد کرنا اس کی ترقی اور جاہ و جلال کا سب سے مضبوط سبب ہوا کرتا ہے۔

دُور کیوں جائیں تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ جب سکھ فرقہ پیدا ہوا اور اُس نے بال و پَر نکالنے شروع کیے تو مغلوں نے ان کے نیست و نابود کرنے کے لیے کیا کیا نہ کیا مگر خدا کے بڑھائے کو کون گھٹا سکتا ہے۔ آخر وہی سکھ ہیں جنہوں نے پشاور سے دہلی تک مغلوں کی سلطنت چھین لی اور سو برس تک جلال و اقبال سے حکومت کی۔ ادھر دکن میں مرہٹوں کا یہی حال تھا جتنا روکا اتنا ہی بڑھتے گئے۔ خدا تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ میں دست اندازی کرنا، اپنے لیے ہلاکت کے سامان فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

**اولاد**

۱۲ اپریل ۱۸۷۲ء کو میری بڑی لڑکی پیدا ہوئی، اُس کا عقیقہ بڑی دھوم دھام سے کیا گیا۔ مولوی امیر الدین صاحب اور مولوی تبارک علی صاحب، جن کو یہاں پہنچے ہوئے صرف پندرہ روز ہوئے تھے، انہوں نے بھی اُس دعوتِ عقیقہ میں شرکت فرمائی۔ اس کے بعد میری دوسری لڑکی پیدا ہوئی۔ محبت کے مارے میں نے اس کا نام اپنی ہندوستان والی لڑکی کے نام پر رکھا۔ اُس کا عقیقہ بھی پہلے کی طرح بڑی دھوم دھام سے کیا گیا۔ اس کے بعد تیسرا بچہ ۲۶ نومبر ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوا۔ اس کا نام بھی میں نے اپنے ہندوستان کے لڑکے کے نام پر محمد صادق رکھا۔

اس لڑکی کی پیدائش کے وقت ایک عجیب سرِ الٰہی ظاہر ہوا، جو غالباً میری تسلی کے لیے تھا وہ یہ کہ جس دن یہ لڑکا کالا پانی میں پیدا ہوا، اسی دن بلکہ اسی وقت میرا بڑا لڑکا محمد صادق پانی پت

---

[1] امام محمد اسماعیل شہیدؒ کے مفصل سوانح حیات کے لیے ملاحظہ فرمائیے "تذکرۂ شہید" از محمد خالد سیف

میں فوت ہوا تھا۔ جب اس کی وفات کی خبر پہنچی، تو میں نے اس کا نعم البدل اور اس کا ہم نام اپنے پاس پاکر صبر و شکر کیا اور اس کی والدہ کو بھی اس کے نعم البدل اور ہم نام مل جانے کی خبر لکھ بھیجی۔

**ہنٹر کی کتاب**

جب میں نے انگریزی سیکھی تو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب OUR INDIAN MUSLMANS دیکھنے کا بڑا شوق پیدا ہوا، تو بڑی مشکل سے سات روپے میں کلکتہ سے ایک نسخہ منگوایا۔ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن تھا۔ جب میں نے کتاب کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ ایک مقام پر ڈاکٹر ہنٹر نے بڑی لمبی چوڑی تمہید باندھ کر لکھا اگر سرکار نے ترحم خسروانہ سے کام لیتے ہوئے وہابیوں کو کبھی کالا پانی سے رہا بھی کر دیا تو وہ اپنی اس رہائی کو اللہ جل جلالہ کی جناب سے سمجھتے ہوئے جب واپس ہندوستان آئیں گے، تو انگریزی حکومت کے لیے پہلے کی نسبت زیادہ تخریب و بربادی کا موجب ہوں گے۔ ہم کا تعصب اور غصہ دیکھ کر ہم تو پہلے ہی رہائی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، یہ زہر آمیز مضمون پڑھ کر رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔

جب گورنمنٹ ہند نے ان دائم الحبس قیدیوں کی رہائی کا حکم جاری کیا جنہیں قید ہوئے بیس سال گزر چکے تھے، تو ہمارے کیس کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ اس سب سے بڑھ کر ناامیدی اس وقت ہوئی جب ۱۸۸۱ء میں خود ڈاکٹر ہنٹر گورنر جنرل ہند کے مصاحب مقرر ہوئے۔ ہم نے خیال کیا کہ جس شخص کی کتاب کو پڑھ کر دانا سے دانا انگریز گمراہ ہو جاتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارا دشمن ہو جاتا ہے تو محکمہ گورنری میں اس کی موجودگی کیا کیا گل نہ کھلائے گی؟

**رہائی کی امیدیں**

لیکن بایں ہمہ غیبی طور پر دل میں الہام ہوا کہ ہم جلد رہا ہو کر ہندوستان جا رہے ہیں! چنانچہ میں نے مولوی انوار الاسلام اور حافظ محمد اکبر

---

لے یاد رہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۱ء اور دوسرا ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔

پانی پتی کو خطوط بھی لکھ دیئے تھے کہ میں جلد ہندوستان آیا چاہتا ہوں۔

جون ۱۸۷۶ء میں خاکسار کا پورٹ بلیر کے جنوبی حصہ ابرڈین میں تبادلہ ہوگیا اور وہاں میں اپنے پرانے آقا اور شاگرد میجر پراتھرو صاحب ڈپٹی کمشنر کا میر منشی مقرر ہوا اور رہائی و روانگی کی تاریخ تک اسی عہدہ پر متعین رہا۔

پراتھرو نے میری اعانت سے پورٹ بلیر کے لیے آئین کی کتاب بھی لکھی جو گورنمنٹ کی منظوری کے بعد مشتہر کی گئی، اس کا اردو ترجمہ بھی میں نے کیا تھا اور وہ بھی چھپ چکا ہے اسی صاحب نے میری چودہ برس کی [illegible]اریوں اور جانفشانیوں پر نظر توجہ کرتے ہوئے میری رہائی کے لیے گورنمنٹ ہند کو بڑی دھوم دھام سے ایک رپورٹ بھیجی۔ اس رپورٹ پر رہائی تو کیا ہوئی البتہ سیکرٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ اس قدر ناراض ہوئے کہ تا زیست رہائی ناممکن ہوگئی اور دوبارہ کسی افسر کے لیے میری رہائی کی رپورٹ کرنے کا حوصلہ ہی باقی نہ رہا۔ ۱۸۸۰ء کے آخر میں مولانا عبدالرحیم کے صاحبزادے مولانا عبدالفتاح صاحب اپنے والد ماجد کی ملاقات کے لیے پورٹ بلیر پہنچے اور کوئی سال بھر رہنے کے بعد واپس چلے گئے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب نے اپنے بیٹے کو ایک درخواست لکھ کر دی، جو ان کی بیوی کی طرف سے لکھی گئی تھی۔ یہ درخواست اپریل ۱۸۸۲ء میں گورنر جنرل ہند کے نام ارسال کی گئی۔ درخواست میں بیان کیا گیا تھا کہ :-

"میرے شوہر پہ کوئی بھاری قصور ثابت نہ ہو سکا تھا۔ اس لیے جب مقدمہ سیشن جج اور چیف کورٹ میں پیش ہوا تو کہا گیا تھا کہ عبدالرحیم نے اگر نیک چلنی کا ثبوت دیا تو مقدمہ پر نظر ثانی کی جائے گی مگر اب تو ۱۴ کے بجائے ۱۸ برس ہو چکے ہیں میں نے اس کی جدائی میں بہت تکلیف اٹھائی ہے اور وہ بھی بہت بوڑھا ہوگیا ہے۔ لہٰذا سرکار کو چاہیے کہ اس کے مقدمہ کی مثل ملاحظہ کرنے کے بعد اسے رہائی بخش دے۔"

اس درخواست کے ملاحظہ کرنے کے بعد لارڈ رپن نے مثل مقدمہ کو طلب کیا نیز پنجاب اور بنگال کی گورنمنٹ سے رائے طلب کی کہ اگر ان وہابیوں کو رہا کر دیا جائے تو اس میں کچھ قباحت تو

نہیں ہے لوکل حکام کی آراء کے انتظار کے لیے مقدمہ کو آئندہ سال کے آغاز تک ملتوی کر دیا گیا۔

یہ درخواست صرف مولانا عبدالرحیم صاحب کے لیے تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا قصور بھی نہ تھا۔ انہیں تو صرف فرضی مفسدوں کی اولاد ہونے کے جرم کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا اس لیے ہمیں صرف ان کی رہائی کا انتظار تھا۔ اس ذریعہ سے اپنی رہائی کا تو گمان بھی نہ تھا۔ خصوصاً اس صورتِ حال میں جب کہ ان دونوں بنگال کورٹ کے سب صاحب لوگ پورٹ بلیر میں جمع ہو گئے تھے اور ہم سے نہایت تعصب سے پیش آتے تھے۔

۱۸۸۱ء میں پیری اور ضعف کی وجہ سے مولانا احمد اللہ صاحب کی حالت زیادہ ہی قابلِ رحم ہو گئی تھی۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۰ سال کے قریب تھی۔ انہوں نے اپنی حالتِ زار کے پیشِ نظر کلکتہ میں مقیم اپنے صاحبزادے مولانا محمد یقین صاحب کو بلانا چاہا اور پورٹ بلیر کے قاعدہ عام کے مطابق یہ ملاقات جائز اور درست تھی اور سینکڑوں بیٹے اپنے اپنے باپ سے آکر مل گئے تھے مگر صرف اس وجہ سے کہ احمد اللہ وہابی ہے، ان کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔

اس اثنا میں میں نے بھی بطورِ امتحان ایک درخواست بھیجی کہ محمد رشید میرے حقیقی برادر زادہ کو میرے پاس پورٹ بلیر آنے کی اجازت دی جائے۔ یہ درخواست بھی سراسر منظوری کے قابل تھی مگر صرف اس وجہ سے کہ سائل وہابی ہے، درخواست مسترد کر دی گئی۔

## مولانا احمد اللہ کا انتقال

جب مولانا احمد اللہ صاحب نہایت کمزور اور چراغِ سحری ہو گئے تو مولانا عبدالرحیم صاحب نے ان کی حالت بیان کر کے حکام کو لکھا کہ میں ان کا قریبی رشتہ دار ہوں۔ ویپر میں ان کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں لہٰذا انہیں ابرڈین میں میرے گھر رہنے کی اجازت دی جائے۔ یہ درخواست جس کے پڑھنے سے سنگ دل سے سنگ دل انسان کا دل بھی موم ہو سکتا تھا محض اس وجہ سے مسترد کر دی گئی کہ احمد اللہ اور عبدالرحیم دونوں وہابی ہیں، ان کے ساتھ یہ رعایت نہیں ہو سکتی۔

جب مولانا موصوف کی حالت نہایت پتلی ہو گئی اور انگریزوں کا تعصب شدت اختیار

اُتارا گیا تو مولانا عبدالرحیم نے یہ درخواست کی کہ انہیں رات کو دیپر ہی مولانا کے پاس رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ بڑی ردوکد اور بحث کے بعد یہ درخواست منظور ہوئی اور مولانا عبدالرحیم کو ۲۰ رنومبر کو شام کے وقت ایک تحریری پاس ملا اور اسی رات ۲۱، نومبر ۱۸۳۱ء (۲۸ر محرم ۱۲۹۸ھ) شب دوشنبہ کو ایک بجے مولانا موصوف کی رُوح اس جسمِ قید در قید کو چھوڑ کر فردوسِ بریں پرواز کر گئی۔ نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ وَبَرَّدَ مَضْجَعَہٗ۔

مولانا کی وفات کے وقت اُن کا ایک ملازم ان کے پاس ہسپتال میں موجود تھا۔ مولانا کئی روز سے بے ہوشی کے عالم میں تھے لیکن وفات کے وقت آپ نے آنکھ کھول کر "الا اللّٰہ مالک الملک" آخری کلمہ زبان سے ادا فرمایا اور اپنے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

۲۱ر تاریخ کو آٹھ بجے صبح ہمیں ابرڈین میں آپ کی وفات کی اطلاع ہوئی تو ہم سب بہت سے احباب کے ساتھ نو بجے دیپر پہنچ گئے۔ میں چونکہ ضلع کچہری میں ملازم تھا اس لیے ضلعدار کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ حکام کے تعصب کی وجہ سے اجازت کا ملنا بھی محال تھا لیکن آپ کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لیے میں اللہ پر توکل کرتے ہوئے اجازت کے بغیر ہی دیپر چلا گیا اور ایک درخواست بھیج دی کہ میں مولانا احمد اللہ صاحب کی تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیے دیپر جا رہا ہوں لہٰذا میری آج کی غیر حاضری کو معاف فرما دیا جائے۔

دیپر پہنچ کر ہم نے انگریزی حکام سے یہ درخواست بھی کر دیکھی کہ ہمیں اجازت بخشی جائے کہ مولانا احمد اللہ صاحب کی لاش کو ابرڈین لے جا کر ان کے حقیقی بھائی مولانا یحییٰ علی صاحب کی قبر کے متصل دفن کر دیں یہ درخواست بھی مسترد کر دی گئی تو مجبوراً غسل اور نمازِ جنازہ کے بعد ڈنڈاس پوائنٹ کے گورِ غریباں میں جو کہ دیپر سے تھوڑی دور ہے انہیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اپنے ان بیس سالہ تجربات سے یہ بھی سیکھا کہ جب کبھی بھی میں نے کسی حاکم یا افسر پر بھروسہ کیا اور خدا کی طرف توجہ نہ دی تو میرے اللہ نے اسی خیالی معاون کے ہاتھ سے مجھے ایذا پہنچانے کا بندوبست کر دیا مگر جب میں نے اس خیال سے تائب ہو کر، اس ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی

طرف رجوع کیا تو اس نے میری مدد فرمائی اور آفت سے نجات بخشی اور جو لوگ پہلے سے میرے دشمن تھے اور جن سے میں ڈرتا تھا، انہی کو میری مدد اور پشت پناہی کے لیے کھڑا کر دیا۔

خدا تعالیٰ کو کسی طرح بھی منظور نہیں ہے کہ میں اس کی طرف سے غافل ہو کر غیر اللہ کی طرف رجوع کروں۔ وہ رب العزت ہمیشہ بار بار کر اور تنبیہ کر کے مجھے شرک سے بچاتا، اور اپنی طرف رجوع کراتا رہا ہے۔

ستمبر ۱۸۸۲ء میں میری بیوی نے پانی پت سے خط لکھا کہ میری بڑی لڑکی جوان ہو گئی ہے تمہاری رہائی کی امید پر آج تک اس کی شادی کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ تمہاری جلد رہائی کی اب بظاہر کوئی شکل نظر نہیں آتی اگر آپ اجازت دیں تو کسی جگہ اس کی شادی کا بندوبست کر دیا جائے نیز اس کا خیر کے لیے آپ کچھ ضروری خرچ بھی بھیج دیں۔ میں نے حکم رہائی کی تاریخ سے اڑھائی ماہ قبل ۱۴ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو زیور اور پارچہ جات کے علاوہ تین سو روپے نقد بھی پانی پت بھیج دیئے اور اپنی بیوی کو لکھا کہ تم کسی دیندار مسلمان سے اس لڑکی کی شادی کر دو۔

جب میرا بھیجا ہوا مال اسباب اور خط پانی پت پہنچا تو اس کی شادی میں میرے شامل نہ ہونے کی وجہ سے خوشی کے بجائے ان لوگوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ میری بیوی اور لڑکی تو رو رو کر یہ دعائیں کرتی تھیں کہ "اے قادر کریم! اس کو بھی اس شادی میں شریک کر۔"

**رہائی**

اس وقت تک میری رہائی کا بظاہر کوئی سامان نہ تھا مگر اس مستجاب الدعوات نے اسی دم ان کی فریاد کو شرف قبولیت سے نوازا۔ ۳۰ دسمبر ۱۸۸۲ء کو کسی درخواست، سعی و کاوش یا سفارش کے بغیر میری رہائی ہو گئی اور مجھ سے بھی پہلے پانی پت میری بیوی کو اس کی اطلاع دی گئی۔ اب جو میری رہائی کا زمانہ قریب آیا تو ہر وقت اپنی رہائی کا منتظر رہتا تھا اور اس ملک کے تحفے تحائف جمع کر کے چلنے کیلئے بالکل تیار ہو گیا۔ اگرچہ بہت سے لوگ میرے معتقد اور محکمہ گورنمنٹ کی کارگزاری کو دیکھ کر میری اس تیاری پر تعجب کا اظہار کیا کرتے تھے۔ آخر کار ۲۲ر جنوری ۱۸۸۳ء بروز دوشنبہ مہارانی انگبوٹ یہ حکم لے کر پہنچا کہ وہابی کیس میں بجرم بغاوت جس قدر

آدمی قید ہیں سب کو رہا کر کے ہندوستان روانہ کر دیا جائے ان کی لوکل گورنمنٹ ان کی سکونت کے لیے معقول بندوبست کرے گی۔ جب یہ حکم وہاں پہنچا تو میرے علاوہ مولانا عبدالرحیم صاحب، میاں عبدالغفار، مولانا تبارک علی، مولانا امیر الدین اور میاں مسعود گل اس مقدمہ کے چھ آدمی وہاں موجود تھے؛ چنانچہ سب کی رہائی ہوگئی۔

اخبارات کے ذریعے ہندوستان میں جب یہ خبر مشہور ہوئی تو اسلامی حمیت کے پیشِ نظر مسلمانوں کی تمام اسلامی انجمنوں اور مجلسوں نے لارڈ رپن کے اس ترحمِ خسروانہ کا بذریعہ میموریل شکریہ ادا کیا۔ جیسے ہماری گرفتاری پر تمام ہندوستان میں کہرام مچ گیا تھا، ویسے ہی اب گھر گھر خوشی اور شکرانہ کی مجلسیں منعقد ہوئیں اور لارڈ رپن کی مداحی اور شکر گزاری سے ہماری زبان اور قلم کبھی قاصر نہ رہے گا۔ جس کی اولوالعزم اور ترحمانہ پالیسی کے باعث ہمیں پھر سے ہندوستان دیکھنا نصیب ہوا۔

اسی عرصہ میں میرے ایک پرانے شاگرد کپتان ٹمپل نے جو میری رہائی کے وقت کیمپ انبالہ میں مجسٹریٹ تھے، میری رہائی کی خبر سن کر مجھے لکھا کہ اگر تم میرے پاس رہنا قبول کرو تو میں گورنمنٹ سے اجازت لے کر تمہیں اپنے پاس بلا لیتا ہوں میں نے اس پیام کو تائیدِ غیبی سمجھ کر فوراً قبول کر لیا انہوں نے گورنمنٹ پنجاب سے اجازت حاصل کر کے اور خود میرے ضامن بن کر نگرانی کی تمام شرائط کو موقوف کرا دیا۔

## روانگی کے انتظامات

جب میری رہائی کا حکم پورٹ بلیر پہنچا تو میری چھوٹی بیوی جو کہ حبسِ دوام میں گرفتار تھی۔ اسے ابھی قید ہوئے فقط چودہ برس ہوئے تھے اس لیے اسی اگست میں گورنمنٹ کو اطلاع دی گئی کہ جب تک محمد جعفر کی بیوی رہا نہ ہوگی، وہ ہندوستان نہیں جا سکتا اور اپنی رہائی کا حکم پاتے ہی میں نے بھی گورنمنٹ پنجاب کو لکھا کہ یہاں میرا نہایت عمدہ گھر موجود ہے، میں سو روپیہ ماہوار کا ملازم ہوں۔ ہندوستان میں یہ گھر ہے اور نہ در اور غالباً یہاں آنے پر حکامِ پنجاب بھی مجھے ناجائز طور پر تنگ کیا کریں گے اور

مجھے قیدی سمجھ کر کوئی ملازمت بھی نہ دیں گے ، اس وجہ سے مجھے امید ہے کہ آپ اجازت دیں گے کہ میں وقتاً فوقتاً ہندوستان جا کر اپنے بیوی بچوں کو دیکھ آیا کروں ، اگرچہ چیف کمشنر صاحب نے پورٹ بلیر میں میری نیک چلنی اور عمدہ کارگزاری کو دیکھ کر سفارش کر دی تھی کہ محمد جعفر کے لیے خاص طور پر سرکاری وظیفہ مقرر کیا جائے تاکہ ہندوستان میں اس کی گزر بسر ہو سکے لیکن گورنمنٹ پنجاب نے میری اس درخواست کو نامنظور کر کے جبراً مجھے اور میرے بیوی بچوں کو ہندوستان بلایا اور ساتھ ہی یہ وعدہ کیا کہ تمہیں پنجاب میں ملازمت دی جائے گی ۔

۳ ر مارچ ۱۸۸۳ء کو مولانا عبدالرحیم ، میاں عبدالغفار ، مولانا امیرالدین اور مولانا تبارک علی سوئے ہندوستان روانہ ہوئے اور بخیر یت تمام اپنے اپنے گھر پہنچ گئے ۔ اس کے بعد ۲۸ اپریل ۱۸۸۳ء کو میاں مسعود بھی چلے گئے اور فقط میں اکیلا اپنی بیوی کی رہائی کے حکم کے انتظار میں رہ گیا ۔ یکم مئی ۱۸۸۳ء کو میری بیوی کی رہائی کا حکم بھی آ گیا مگر اس وقت میری بیوی چھ ماہ سے امید سے تھی اور سمندر میں طوفانی موسم شروع ہو چکا تھا اس لیے میں نے نومبر ۱۸۸۳ء (محرم ۱۳۰۱ھ) تک پورٹ بلیر میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی ۔ اس مدت میں میں نے اپنے گھر کا سامان فروخت کرنا شروع کر دیا اور اونے پونے بیچ دیا ۔

## تعصّب کی انتہا

اکتوبر ۱۸۸۳ء میں میں نے چاہا کہ اپنے چوبی گھر کو مسجد بنا کر فی سبیل اللہ وقف کر دوں ۔ سب مسلمان جو بغیر مسجد کے تکلیف اٹھاتے تھے اس خواہش سے بہت خوش ہوئے مگر ڈپٹی کمشنر ہرتج صاحب نے از راہِ تعصب یہ رپورٹ بھیج دی کہ یہ شخص وہابی ہے اور مسجد بھی وہابیوں کے قبضہ میں رہے گی لہٰذا مسجد بنانے کی اجازت نہ دی جائے اس طرح وہی تعصب وہابیت اس کارِ خیر میں مانع ہوا ۔

## انڈمان کا انتظامِ حکومت

جیسا کہ میں نے پورٹ بلیر میں اپنی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے یہاں کے جغرافیہ اور قدیم باشندگان کے حالات

بیان کیے تھے۔ اسی طرح اس مقام پر پورٹ بلیر سے روانگی کے ذکر سے قبل ساکنانِ پورٹ بلیر کے قوانین اور طرزِ زندگی پر کچھ روشنی ڈال کر اس جزیرے سے رختِ سفر باندھتا ہوں۔

یہ جزیرہ دوسرے جزیروں کی طرح گورنمنٹ کی مستقل مملکت ہے چیف کمشنر صاحب کو اختیار ہے جو قانون چاہے بنائے، جسے چاہے دیوانی و فوجداری اختیارات کا قلم دان سونپ دے۔ چیف کمشنر ہی یہاں کا سیشن جج بھی ہے اور اس کا حکم حکمِ ناطق ہے اس کے بعد اپیل نہیں ہو سکتی۔ صرف مقدماتِ پھانسی کے لیے گورنر جنرل کے اجلاس کونسل کی اجازت ضروری ہے۔ دیگر سب امور میں خواہ دیوانی ہوں یا فوجداری چیف کمشنر ہی ہائی کورٹ کے فرائض سرانجام دیتا ہے چیف کمشنر کی اجازت کے بغیر یہاں سے کوئی مسافر، جہاز یا مال و اسباب نہیں گزر سکتا۔ چیف کمشنر صدر مقام روس میں رہتا ہے اور اس کی تنخواہ تین ہزار روپیہ ماہوار ہے۔

یہ جزیرہ جنوبی و شمالی دو ضلعوں میں تقسیم ہے۔ جنوبی ضلع کا صدر مقام ابرڈین ہے اور شمالی ضلع کا چاٹم۔ دونوں ضلعداروں کے ماتحت دوسرے بہت سے اسسٹنٹ اور کمشنر کام کرتے ہیں۔ ۱۸۵۸ء کی ابتداء سے لے کر اب تک اس سیٹلمنٹ کے دستور العمل اور قواعد میں بے شمار دفعہ تبدیلی ہوئی ہے اور ہمیشہ زیادہ سے زیادہ سختی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور کیفیت یہ ہے کہ ؎ ہر کہ آمد براں مزید کرد

## قیدیوں کے لیے قوانین

ہر سال دو ہزار کے قریب قیدی ہندوستان سے قید کر کے یہاں بھیجے جاتے ہیں، اس وقت یہاں چودہ ہزار کے قریب قیدی موجود ہیں۔ جہاز سے اتر کر جب ایک مہینہ ہو جاتا ہے تو اُن کی بیڑیاں کاٹ دی جاتی ہیں۔ یہاں جیل خانے نہیں بنائے گئے بلکہ قیدیوں کو بارکوں میں قیدی افسروں کے ماتحت رکھا جاتا ہے۔ ہندوستان کی جیلوں کی طرح یہاں بھی قیدیوں سے دن بھر سخت مشقت لی جاتی ہے، دو وقت کھانا دیا جاتا ہے اور رات کو بارکوں میں ہی سلایا جاتا ہے۔ بارکوں کی حفاظت کے لیے قیدی افسروں کے علاوہ اور کوئی پولیس یا جنگی پلٹن نہیں ہوتی الغرض قیدیوں کی حفاظت

نگرانی اور تقسیم کار وغیرہ سب قیدی افسروں کے سپرد ہے، جو سر پر لال دوپٹہ اور گلے میں پیڑا اس ڈال کر رہتے تھے اور اپنے اپنے مدارج کے مطابق حکومت سے تنخواہ بھی وصول کرتے ہیں۔

نئے قیدیوں کو بھی بشرط نیک چلنی تین چار برس کے بعد تنخواہ ملنے لگتی ہے۔ تنخواہ پانے کے بعد یہ قیدی بھی پٹے والے افسر مقرر ہو جاتے ہیں۔ دس برس نیک چلن رہنے کے بعد ہر قیدی ٹکٹ کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ٹکٹ پانے والا قیدی بارک سے آزاد ہو جاتا ہے اور اسے اجازت ہوتی ہے کہ جس شہر یا بستی میں چاہے سکونت اختیار کرے اور جو چاہے کسبِ معاش کا طریقہ اختیار کر کے کمائے اور کھائے۔

قیدیوں کی پچاس ساٹھ کے قریب بستیاں بھی موجود ہیں، ان میں نمبردار، پٹواری اور چوکیدار سب قیدی ہیں۔ جو قیدی کھیتی باڑی کرنا چاہیں انہیں گاؤں میں سرکار کی طرف سے پندرہ بیگھے زمین مفت مل جاتی ہے، تین برس تک محصول بھی معاف رہتا ہے بلکہ کبھی کبھی حکومت نقدی، بیل اور خوراک کی صورت میں بھی مدد کرتی رہتی ہے۔ جو لوگ حلوائی، نانبائی یا نائی وغیرہ کے طور پر کام کرنے کے لیے ٹکٹ حاصل کرتے ہیں، انہیں بھی کبھی کبھی حکومت کی طرف سے امداد مل جاتی ہے۔ اس قسم کے ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد قیدی آزاد ہوتا ہے کہ جو چاہے کرے۔

قیدی عورتیں ایک الگ جزیرہ میں لیڈی افسروں کے ماتحت بارکوں میں رکھی جاتی ہیں۔ جب تک بارک میں رہتی ہیں، زناکاری کی پوری پوری روک تھام کی جاتی ہے۔ عورتوں کو بھی بارکوں میں پسائی اور سلائی وغیرہ کی مشقت کرنا پڑتی ہے۔ عورتوں کو پانچ سال بعد آزادی کا ٹکٹ دے دیا جاتا ہے لیکن جوان عورتیں جب تک شادی نہ کر لیں، انہیں ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد بھی بارک سے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔

پانچ برس کی مدت گزرنے کے بعد عورت کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ جس مرد سے چاہے شادی کر لے لیکن مردوں میں سے صرف انہیں شادی کی اجازت حاصل ہوتی ہے جو ٹکٹ حاصل کر چکے ہوں۔ جو آدمی شادی کرنا چاہے وہ عورتوں کے جزیرہ میں جا کر کسی عورت کو پسند کر لیتا ہے

اور اسے کچھ دے دلا کر شادی پر راضی کر لیتا ہے اور جب دونوں راضی ہو جاتے ہیں، تو انہیں اپنی رضامندی اور محبت و موافقت سے مل کر رہنے کا اقرار نامہ لکھ کر چیف کمشنر کو دینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد بیوی اپنے خاوند کے گھر چلی آتی ہے۔

ٹکٹ والے قیدی ملک سے اپنے بیوی بچوں کو بھی بلا سکتے ہیں۔ جب کوئی قیدی بیس برس تک نیک چال چلن رہے تو اس کی رہائی بھی ہو جاتی ہے اور اسے اختیار ہوتا ہے، چاہے یہاں رہے، چاہے اپنے وطن مالوف چلا جائے۔ ٹکٹ حاصل کر لینے والے قیدیوں کو اختیار ہوتا ہے کہ حلال کمائی سے خواہ لاکھوں روپیہ جمع کر لیں لیکن ٹکٹ سے قبل اسے اپنے پاس رکھنے یا کسی دوسرے کے پاس جمع کرانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ بارک کے ایام میں قیدی ایک سال یا تین مہینے بعد ایک خط اپنے گھر بھیج سکتے ہیں اور ایک خط اپنے وطن سے وصول کر سکتے ہیں، لیکن ٹکٹ والوں کو اجازت ہوتی ہے کہ مہینہ میں ایک خط بھیج سکتے ہیں اور ایک خط وصول کر سکتے ہیں۔

## مختلف زبانیں

پورٹ بلیر ایک ایسی جگہ ہے جہاں چینی، برمی، ملائی، سنگلی، جنگلی، نکوباری، کشمیری، پشتونی، ایرانی، عربی، حبشی، پارسی، پرتگیز، امریکی، انگریز، ڈین اور فرنچ اور اسی طرح ہندوستان کے تمام ضلعوں اور شہروں کے مثلاً بھوٹیا، نیپالی، پنجابی، سندھی، گجراتی، اہل برج، آسامی، تھلی، بندیلکھنڈی، اوڑیا، تلنگی، مرہٹے، کرناٹکی، مدراسی، ملیالم، گونڈ، بھیل، بنگالی، گول اور سنتھال وغیرہ ہر قسم کے لوگ موجود ہیں جب یہ لوگ آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو اپنی اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں لیکن بازار اور کچہریوں کی زبان بھی یہاں بھی ہندوستانی ہے۔ ہر ملک کا باشندہ یہاں آ کر خود بخود ہندوستانی زبان سیکھ جاتا ہے کیونکہ اس زبان کے بغیر یہاں گزارا ممکن نہیں۔ میرے خیال میں روئے زمین پر اور کوئی ایسا خطہ نہ ہوگا جہاں اس قدر کثیر قومیں آباد ہوں۔ جہاں پچاس سے قریب مختلف قوموں کے افراد رہ رہے ہیں۔ شان الٰہی سے یہاں ایک ایسا میلہ اور مجمع لگا رہتا ہے

کہ روئے زمین پر کسی دوسری جگہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ جب کوئی بنگالی مرد اور مدراسی عورت یا بھوٹیا مرد اور پنجابی عورت علیٰ ھذا القیاس دو مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والا جوڑا شادی کرتا ہے تو خاوند اپنی بیوی اور بیوی اپنے خاوند کی زبان سے ناآشنا ہوتی ہے۔ تکرار اور لڑائی کے وقت جب وہ ایک دوسرے کو اپنی مادری زبان میں گالی دیتے ہیں اور فریق ثانی کچھ نہیں سمجھتا، تو ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب کسی تقریب شادی وغیرہ پر ملک ملک کی عورتیں جمع ہو کر اپنی اپنی بولی میں گاتی، اپنی وضع پر ناچتی کودتی اور اپنے اپنے ملک کا لباس زیب تن کرتی ہیں، تو یہ منظر بھی دید کے قابل ہوتا ہے۔

## مختلف اقوام اور ان کی معاشرت

یہاں قوم کی پابندی، جو ہندوستان کی پرانی بیماری ہے، یک قلم متروک ہو گئی۔ مسلمان مرد خواہ کسی ذات کا ہو ہر مسلمان عورت سے بلا روک ٹوک شادی کر سکتا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں میں بھی ہندو ہونا کافی ہے۔ ایک ذات کا ہونا ضروری نہیں۔ برہمنوں کے گھروں میں بامنیں اور جاٹوں کے گھروں میں برہمنیاں موجود ہیں۔

یہاں ٹھگ وہ ٹھگ ہیں اور چور وہ ہیں کہ آنکھوں کا کاجل چرا لیں۔ یہاں شعبدہ باز بازی گر، بہروپیے، جھنڈیلے، نقال، ہیجڑے، نٹ، طوائف، میراثی گویئے اور ہر فن کے نیک و بد موجود ہیں۔ نیک اور اچھے لوگوں کا بھی یہ حال ہے کہ کوئی جزیرہ ایسا نہیں جس میں مولوی، پنڈت اور درویش موجود نہ ہوں۔

مدراسی اور بنگالی سوکھی مچھلی بڑے مزے سے کھاتے ہیں۔ اس سوکھی مچھلی کو جس سے سڑے ہوئے چمڑے کی سی بو آتی ہے، عمدہ سے عمدہ گوشت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح یہاں برما اور چین کے لوگ نپئی کھاتے ہیں۔ مچھلیوں کو پیپوں میں بھر کر سڑانے سے جب ان میں کیڑے پڑ جاتے ہیں تو ان کیڑوں اور سڑی مچھلیوں کو کوٹ کر نپئی بنائی جاتی ہے۔ اس میں ایسی بدبو ہوتی ہے کہ ہم لوگ بڑا سے بڑا ایک میل پر بھی اس کی بدبو برداشت نہیں کر سکتے مگر برما اور چین

کے لوگ اسے بہ عمدہ کھانے پر گرم مصالحہ کے طور پر چھڑک کر کھاتے ہیں اور بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ جب انہیں پپی مل جائے تو سمجھتے ہیں دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت مل گئی۔

طوائف کی عام دوکانیں گو یہاں نہیں لیکن اکثر عورتیں ایسی بے حیا اور فاحشہ ہیں کہ کسبیوں کو بھی ان سے شرم آتی ہے۔

تجربے سے معلوم ہوا کہ ہر کسی کو اپنی وضع، رسم، بولی، لباس اور خوراک پسند ہے۔ جنگلی اپنے جنگل میں رہنے، ننگ دھڑنگ چلنے پھرنے اور کیڑے مکوڑے کھانے کو ہماری قبا اور دوشالوں اور زردہ و پلاؤ پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے کھانوں سے ان کو قے ہونے لگتی ہے، ہمارے کپڑے پہننے سے انہیں تکلیف ہوتی ہے جیسے ہمیں ننگا رہنے سے۔ برما اور چین کے لوگ ہمارے گھی کے بگوان کو دیکھ کر ناک بند کر لیتے ہیں۔ ہمارے قلیے، قورمے اور پلاؤ کے بگھار سے برمیوں کا دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے۔ انگریز ہمارے عطر کو نہیں سونگھ سکتے۔ الغرض بچپن سے زبان اور ناک جس چیز کی عادی ہو جاتی ہے، اسے صرف وہی پسند ہے۔

## الوداعی ضیافت

۹ر نومبر ۱۸۸۳ء کو جب میں رختِ سفر باندھنے کو تھا تو میں نے ایک عام دعوت کر کے اپنے سب دوستوں کو اس میں مدعو کیا۔ دعوت نامہ کی پیشانی پر میں نے لکھا تھا کہ:-

> "یہ خاکسار اٹھارہ برس کے قیام کے بعد اب بظاہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان جا رہا ہے۔ امید ہے آج میرے تمام کرم فرما جن کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں، قدم رنجہ فرما کر خاکسار کے ساتھ آخری ماحضر تناول فرما کر مشکور و ممنون فرمائیں گے"۔

جس کسی کو بھی یہ دعوت نامہ موصول ہوا، بلا تکلف چلا آیا۔ یہ دعوت میرے گھر پر میرے روانہ ہونے سے صرف ایک گھنٹہ پہلے قبل از دوپہر ہوئی تھی۔ میری جدائی کی وجہ سے حاضرین میں سے ہر ایک کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ بہت سے احباب اس مجلس میں کچھ تقریر

بھی کرنا چاہتے تھے مگر دو لفظ کہنے کے بعد سب کی ہچکی بندھ جاتی تھی۔ میں خود بھی ایک نصیحت آمیز لمبی چوڑی تقریر کرنا چاہتا تھا لیکن ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا اور دل کے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔

## مولانا لیاقت علی الہ آبادی

اس دن اتفاق سے جمعۃ المبارک تھا۔ تناولِ طعام اور مولانا لیاقت علی کے ساتھ آخری نمازِ جمعہ ادا کرنے کے بعد گاڑیاں تیار کھڑی تھیں۔ میں لواحقین کے ساتھ سوار ہو کر روس چلا آیا۔ صدہا مرد عورتیں مجھے روس تک الوداع کرنے میرے ساتھ آئیں۔ جب چار بجے شب بیوی بچوں کے ہمراہ کشتی پر سوار ہوا تو بے شمار خلقت خوشی اور رنج کے ملے جلے جذبات کے ساتھ زار زار رو رہی تھی۔

اس وقت بیوی اور آٹھ بچے میرے ساتھ تھے اور آٹھ ہزار کے قریب میرے پاس جائیداد تھی۔ اس وقت میں اس کیفیت پر نہایت تعجب کا اظہار کر رہا تھا کہ جب ۱۱ر جنوری ۱۸۶۶ء کو اسی گھاٹ پر جہاز سے اترا تھا تو میں نے لنگوٹی باندھ رکھی تھی اور تن تنہا تھا اور اب جب کہ اس رنج اور محن کی جگہ سے جا رہا تھا تو بیوی، آٹھ بچے اور آٹھ ہزار روپے کی جائیداد میرے پاس تھی۔ قدرتِ الٰہی کی کرشمہ سازی ملاحظہ فرمائیے کہ حکامِ دنیا نے مجھے بے خانماں کر کے سخت سزا کے لیے یہاں بھیجا تھا مگر اس حاکمِ حقیقی نے جس کے قبضہ تصرف میں دنیا و ما فیہا کا انتظام ہے دشمنوں کے ہاتھ سے میرے ساتھ کتنے اچھے سلوک کرائے۔

یہ جہاز جس پر سوار ہونے کے لیے میں تیار تھا بالکل اسی جگہ کھڑا تھا جہاں وہ جنا جہاز لنگر انداز ہوا تھا جس پر میں آیا تھا۔ اس دن صبح کے وقت جہاز سے اترا تھا اور آج شام کو سوار ہو رہا تھا۔ میں نے اس جزیرہ میں زندگی کی اٹھارہ بہاریں بسر کیں لیکن آج یہ سب کچھ مجھے ایک خواب معلوم ہو رہا تھا اور چشمِ تصور سے یہاں محسوس ہو رہا تھا گویا آج ہی صبح جہاز سے اُترا تھا اور شام کو سوار ہو رہا ہوں۔

میں نے چلنے سے چند روز پہلے زادِ راہ کے سوا اپنی کل جائیداد شرعی حصوں کے مطابق

اپنی دونوں فیملیوں پر تقسیم کر دی اور خود دولتِ دنیا سے سبکدوش ہو گیا۔ اب میری ذاتی جائیداد چند کتابوں اور چند جوڑے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

## ہندوستان کو روانگی

شام کے پانچ بجے کے قریب ہم نے مہارانی اگنبوٹ پر سوار ہو کر ایک جگہ ڈیرہ ڈال لیا۔ اس جہاز پر ہمارے علاوہ اور بھی بہت سے رہائی حاصل کرنے والے مرد عورتیں، یورپین اور ہندوستانی مسافر بھی سوار تھے۔ موسم نہایت خوشگوار اور سمندر پُرسکون تھا۔ موجیں تھیں اور نہ تلاطم۔ اس دن محرم کی دس تاریخ تھی، چودھویں صدی شروع ہو گئی تھی۔ غروبِ آفتاب کے وقت جہاز نے لنگر اٹھایا اور چشم پُر آب کے ساتھ ہم نے جزائر انڈمان کو خیر باد کہہ کر پیچھے چھوڑنا شروع کر دیا۔ اب رات شروع ہو گئی تھی۔ چاندنی رات میں سمندر کی لہروں کا نظارہ بڑا فرحت بخش تھا۔ دوسرے دن جہاز جزیرہ کوکو میں پہنچ گیا۔ دو دن بعد کچھ بارش بھی ہوئی، جس سے مسافروں کو قدرے تکلیف کا سامنا کرنا پڑا، مگر جب جہاز تھوڑا سا اور آگے چلا گیا تو بارش تھم گئی اور تکلیف رفع ہو گئی۔

علی رضا نامی ایک مشہور تاجر نے جہاز پر ہماری خوب خاطر تواضع کی۔ دونوں وقت عمدہ کھانا، گوشت، مچھلی، چائے، کافی، برف، ہر قسم کے پھل اور مٹھائیاں ہمارے لیے لاتا۔ الغرض یہ سفر بڑے ہی راحت و آرام کے ساتھ طے ہوا۔

جب بارش کی وجہ سے سب مسافر تربتر کانپ رہے تھے، اس وقت رہائی پا کر جانے والے مسافر نور الدین کی عورت کو دردِ زہ شروع ہوا۔ اس حالت میں کہ زچہ پانی کانپ رہی تھی، اس کے ہاں پلوٹھے بچے نے جنم لیا اور اس دن تو بے چاری کو مشکل سے دال بھات ملا ہو گا مگر اسے یا اس کے بچے کو کوئی تکلیف نہ ہوئی بلکہ دونوں صحیح سالم اور تندرست تھے۔

**کلکتہ** جب جہاز کلکتہ بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا، اس نومولود بچے کی عمر صرف دو دن ہوئی

اس کی والدہ بچے سمیت زندہ وسلامت ہوئی جہاز سے اُتری اور پھر اس کے خاوند نے کلکتہ سے لاہور کا ٹکٹ لیا اور زچہ وبچہ خوش وخرم لاہور روانہ ہو گئے۔ سمندر میں جنم لینے کی وجہ سے بچے کا نام بھی سمندر ہی رکھا گیا۔

چار دن اور چار رات کے سفر کے بعد اللہ کے فضل سے ہم ۱۴ر نومبر ۱۸۸۳ء (۱۴ر محرم ۱۳۰۱ھ) کو کلکتہ پہنچ گئے تھے۔ وہاں چنیا پاڑہ میں مولانا عبدالرحیم صاحب کے برادر مولانا عبدالرؤف صاحب کے گھر رہے۔ وہاں سے تیسری رات ۹ بجے ریل پر سوار ہوئے اور کلکتہ سے الٰہ آباد، کانپور، علی گڑھ اور سہارنپور کا منزل بہ منزل ٹکٹ لیتے ہوئے ۲۱ر نومبر ۱۸۸۳ء کو بوقت ۹ بجے شب انبالہ کے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔

## انبالہ

کلکتہ سے دو سپاہی اور ایک نائک ہمارے اہل وعیال اور مال کی حفاظت کے لیے بطور اردلی انبالہ تک ہمارے ساتھ آئے تھے۔

انڈمان میں چونکہ سارا سال موسم معتدل رہتا تھا۔ اس لیے انہوں نے پہلے کبھی گرمی سردی کو نہ دیکھا تھا۔ ہم چونکہ نومبر کے آخر میں کلکتہ میں آئے تھے اس لیے سردی سے انہیں قدرے تکلیف بھی ہوئی لیکن پھر آہستہ آہستہ عادی ہو گئے۔

ہر موسم میں جگہ جگہ کا پانی اور طرح طرح کے پھل کھانے کی وجہ سے میرے بیوی بچوں کی طبیعت نہایت شاداں وفرحاں تھی۔ پورٹ بلیر سے انبالہ تک کا سفر نہایت خوشگوار رہا۔ ہر دن عید اور رات شب برات کی کیفیت رہی۔

ایک دن وہ تھا کہ ہم ۲۲ر فروری ۱۸۶۵ء کو انبالہ جیل سے زیور آہنی جو گیا نہ لباس اور گلیم سیاہ سے آراستہ وپیراستہ ہو کر انبالہ پولیس کے زیر حراست مغرب کو روانہ ہوئے تھے اور بڑے آلام ومصائب کا تختۂ مشق بنتے ہوئے گیارہ ماہ میں انبالہ سے کالا پانی پہنچے تھے اور ایک دن یہ ہے کہ ہم بڑے آرام وآسائش کے ساتھ دریائی سفر طے کر کے کلکتہ پہنچے اور وہاں سے ریل کے سپیشل درجہ میں بلا شرکت غیرے اپنے ہی دس افراد پر

مشتمل خاندان کو لے کر انبالہ آئے ۔ نقد و جنس اور عمدہ لباس کو دیکھ کر ہم نواب معلوم ہوتے تھے ۔ پورٹ بلیئر سے ٹھیک گیارہ دن بعد انبالہ پہنچ گئے ۔

میری اس کیفیت ، شان ، اولاد و مال و منال کو دیکھ کر لوگ تعجب کا اظہار کرتے تھے ۔ دوست خوش تھے اور دشمن ناخوش ۔ راستہ میں جہاں بھی اُترتا تو ہر شہر کے مسلمان میرا نام سُن کر میری مُلاقات کے لیے دیوانہ وار دوڑتے چلے آتے تھے اور میری کیفیت دیکھ کر کہتے تھے کہ اللہ جل جلالہٗ بڑا قادر ہے ، وہ سب کچھ کر سکتا ہے ۔ جو بھی میری حالت سے واقف تھا وہ کہتا تھا کہ تمہارا اس ملک میں اس شان آنا ، مُردے کے زندہ ہونے سے کم نہیں ہے ، جو اس کرامت کو دیکھ کر ایمان نہ لائے وہ دل اور آنکھوں دونوں کا اندھا ہے ۔

ذرا غور فرمایئے یہاں مجھ سے ایک بیوی چھوٹی تھی ، کالا پانی میں دو بیویاں عنایت ہوئیں ۔ یہاں دو بچے چھوٹے تھے وہاں آٹھ مرحمت ہوئے ۔ اسی طرح مال و اسباب اور نقد و جنس ہر ایک کا اللہ تعالیٰ نے مجھے نعم البدل عنایت فرمایا ، جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں آیا ہے :

وَ اٰتَیْنٰہُ اَھْلَہٗ وَمِثْلَھُمْ مَّعَھُمْ

رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِکْرٰی

لِلْعٰبِدِیْنَ ○

یہ آیت میرے اوپر بھی من و عن صادق آتی ہے مگر میرے اس قصّہ سے جو آیات الٰہی میں سے ایک بڑی روشن آیت ہے ، صرف عابدین و صالحین ہی کو عبرت و نصیحت ہو سکتی ہے ، منکرین و منافقین کو نہیں ۔

**انبالہ** دوسرے دن فجر کے وقت ہم انبالہ شہر پہنچے اور وہاں کے حکام سے اجازت لے کر اپنے آقائے قدیم کپتان ٹمپل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ جب میں کپتان ٹمپل کے بنگلہ پر گیا تو وہ دوڑ کر میرے ملنے کے لیے باہر آئے

اور اندر لے جاکر مجھے مُوڑھے پر بٹھایا اور نہایت تسلّی وتشفی کی اور فرمایا کہ آج سے بیس روپے ماہوار تنخواہ آپ کو اپنی جیب سے دیا کروں گا اور آپ کی ملازمت کے لیے بھی جلد ہی کوئی اچھا انتظام کروں گا۔

کپتان ٹیل کی کوشش سے بہت سے انگریز مجھ سے پڑھا کرتے تھے۔ میرے یہاں پہنچنے سے سوا برس بعد تک کپتان نے پچاس روپیہ ماہوار کا میرے لیے انتظام کر دیا تھا۔ اپریل ۱۸۸۶ء کو جب وہ یہاں سے گئے تو یہ سلسلہ ختم ہوگیا بلکہ پولیس نے میری نگرانی شروع کر دی اور مجھ پر سختی بھی بڑھا دی گئی۔

انبالہ پہنچنے کے بعد جب میں نے اپنے اس بیس سالہ سفر کی ہندوستان کے نقشہ کی مدد سے پیمائش کی تو معلوم ہوا کہ انبالہ سے براستہ لاہور وبمبئی کالا پانی تک اور کالا پانی سے براستہ کلکتہ انبالہ تک سات ہزار میل مسافت بنتی ہے اور اس سفر میں ہندوستان کے بعض شمالی اضلاع کو چھوڑ کر تقریباً پورے ملک کا طواف ہوگیا۔ انبالہ کے صدر بازار میں میں نے ایک مکان کرایہ پر لے لیا اور اہل وعیال سمیت اس میں سکونت اختیار کر لی۔

**دہلی**

جب گھر کے لیے سب ضروری سامان خرید لیا تو ۱۱ر دسمبر ۱۸۸۳ء کو ایک ہفتہ کی رخصت لے کر بذریعہ ریل دہلی گیا۔ وہاں ایک رات رہ کر دوسرے دن بذریعہ یکّہ پانی پت پہنچا۔ اتفاق کی بات ہے پورے بیس برس قبل جب میں پانی پت سے دہلی کی طرف بھاگ گیا تھا تو اس وقت بھی دسمبر کی تیرہ ۱۳ تاریخ تھی اور آج جب بیس برس بعد واپس آیا تو دسمبر کی تیرہ ۱۳ تاریخ ہی تھی۔ وہی سڑک، وہی موسم اور وہی تاریخ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ میں آج صبح ہی بیوی بچوں کو چھوڑ کر دہلی گیا تھا اور آج ہی واپس آگیا ہوں۔

**پانی پت**

مغرب کی نماز کے بعد پانی پت میں اپنے گھر پہنچا۔ میری بیوی اور لڑکے مجھے دیکھ کر باغ باغ ہوگئے۔ فرار کے دن جو بچہ چند دن کا تھا اب بیس برس کا ہو چکا تھا۔ پانچ دن ٹھہرنے کے بعد براستہ کرنال تھانیسر چلا گیا اور ایک رات

اور چند گھنٹے تھانیسر میں قیام کرنے کے بعد پھر انبالہ لوٹ آیا۔

جس جس شہر میں بھی یہ عاجز گیا، ہزاروں خلقت میری آمد کی خبر سُن کر میری ملاقات کے لیے آتی تھی۔ تھانیسر میں تو اس قدر اژدہام خلائق ہوا کہ میں اس رات سو بھی نہ سکا اور جگہ کی تنگی کی وجہ سے بہت سے لوگ میری ملاقات سے محروم رہ گئے۔ انبالہ میں تو کئی مہینوں تک دور دراز سے آنے والے لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ لوگ میرے منہ کو دیکھ کر خدا کی قدرت پر تعجب کرتے تھے۔

**تھانیسر**

۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کو جب میں نے تھانیسر سے قدم اٹھایا، اس پر زوال شروع ہو گیا۔ بیس سال میں آبادی ساتویں حصّہ سے بھی بہت کم رہ گئی۔ مکانات منہدم ہو گئے، گلی کوچے مسدود ہو گئے اور انسانوں کے بجائے بندروں نے کھنڈرات کو اپنا مسکن بنانا شروع کر دیا لیکن خدا تعالیٰ نے قرائن سے مجھے معلوم کرا دیا کہ یہ شہر پھر دوبارہ نہایت دھوم دھام سے آباد ہو گا۔

تھانیسر میں مَیں نے اپنے مولد و مسکن پر جا کر مالک مکان سے جو اس وقت اس میں آباد تھا، منت سماجت کر کے یہ اجازت چاہی کہ مستورات کو کسی ایک کمرہ میں الگ کر دو اور مجھے مکان کے اندرونی قطعات کی زیارت کر لینے دو۔ مالک مکان نے مجھے پہچان لیا، نہایت اخلاق سے پیش آیا اور اس نے مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اس جگہ بھی مجھے قدرتِ الٰہی یاد آئی کہ جس مکان کو میں نے ہزاروں روپے صرف کر کے تعمیر کیا تھا، اس میں اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ خدا سے اُمید ہے کہ وہ اس مکان کو قبول کر کے اس کے بجائے مجھے آخرت میں مکان عنایت فرمائے گا۔ اب اللہ تعالیٰ کے چند انعامات کا تذکرہ کر کے اس بیس سالہ سرگذشت کو ختم کرتا ہوں۔

**انعاماتِ الٰہی**

اللہ تعالیٰ کا مجھ پر سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ تاریخ قید سے لے کر آج تک میں جہاں اور جس جگہ رہا اس نے مجھے اپنے سایۂ

حافظت میں رکھا۔ بیس برس میں ایک دن بھی مشقت کرنے کی نوبت نہ آنے دی۔ کالاپانی پہنچنے سے پہلے ہی اس نے میری راحت کے سامان فراہم کر دیئے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے ایک بڑا سرکاری عہدہ مل گیا۔ کالاپانی پہنچنے سے فقط چار پانچ سال قبل ان جزائر کا آباد ہونا، پورٹ بلیر کے قیدیوں کے قوانین میں نرمی و آسانی، ہمارے پہنچنے سے قبل جنگل کی صفائی اور مہلک امراض کا خاتمہ، بیس برس تک بڑے آرام و آسائش سے زندگی بسر کرنا اور ایسی مایوس کن بلا سے حکام بالا کے تعصب کے باوصف شان و شوکت اور مال و اولاد کے ساتھ صحیح و تندرست بلکہ پہلے سے بھی بہتر حالت میں واپس آنا یہ سب میرے مولا کے مجھ پر انعامات نہیں تو اور کیا ہیں؟

ہندوستان واپس آنے کے بعد، آب و ہوا کی سخت تبدیلی کے باوصف میرے بچے تندرست ہیں۔ بلکہ یہاں آکر اللہ تعالیٰ نے مجھے دو اور بچے بھی عطا فرمائے حالانکہ دوسرے لوگوں کے بچے جو کالاپانی سے آئے تھے یہاں آکر بہت کم بچے۔ اس علاقے میں جب بھی کوئی متعدی مرض پھیلتا ہے، میرا گھر محفوظ رہتا ہے۔ میرے یہاں پہنچنے کے بعد یہاں بارش و باراں بھی بکثرت ہونے لگ گئی ہے اور غلہ بھی نہایت ارزاں ہو گیا ہے۔

جب بیس برس بعد میری رہائی ہوئی تو تقاضائے بشریت کے مطابق مجھے بھی یہ فکر دامن گیر تھا کہ ہندوستان جا کر کہاں رہوں گا اور کیا کروں گا۔ کیونکہ تھانیسر میں میرے مکانات اور اراضی وغیرہ کو حکومت نے بحق سرکار ضبط کر کے نیلام کر دیا تھا اور ضلع انبالہ کے حکام ہمارے وہی پرانے رفیق تھے، جنہوں نے کالاپانی بھیجا تھا۔ اس تردد اور انتشار کے وقت میں اس قادر کریم اور مقلب القلوب نے کپتان ٹمپل کے دل میں میرے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیئے۔ وہ میری واپسی کے ابتداء میں جب کہ ہر انگریز میری صورت سے متنفر تھا، میری طرف سے مدتوں بطور وکیل لڑتا رہا اور اس نے دنگا وغیرہ کی طرف سے بھی مجھے فارغ البال کر دیا۔

## ریاست ارنولی میں ملازمت

جب ٹپل صاحب یہاں سے تبدیل ہو کر چلے گئے تو انہوں نے میری درخواست کے بغیر خود بخود ریاست ارنولی میں میرے لیے معقول روزگار کا بندوبست کرا دیا، جہاں میں اب تک بڑے آرام و آسائش کے ساتھ ملازمت کر رہا ہوں۔ یہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے محض غیبی طور پر میرے روزگار اور آسائش کے سامان غیر مسلموں کے ہاتھوں فراہم کرا دیئے حالانکہ بظاہر ان سے ہمدردی کی کوئی توقع نہ تھی۔

## مکمّل آزادی

ہندوستان واپس آنے کے بعد پولیس کی جو نگرانی متعین ہوئی تھی، وہ کپتان ٹمپل نے اپنی ذمہ داری اور ضمانت سے موقوف کرا دی تھی۔ کپتان کی تبدیلی کے بعد بغیر کسی سفارش کے محض اللہ کے فضل سے ۷ فروری ۱۸۸۸ء کو سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب کی طرف سے چٹھی نمبر ۱۸۸ موصول ہوئی جس میں ہر قسم کی پابندی اور نگرانی کے خاتمہ کا اعلان تھا حالانکہ میرے دیگر پانچوں اصحاب بجن مولانا عبدالرحیم وغیرہ سے ابھی تک نگرانی موقوف نہیں کی گئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب میں بالکل آزاد ہوں، جہاں چاہوں رہوں اور جو چاہے روزگار اختیار کروں۔ کاروبار کے سلسلہ میں ہمیشہ لاہور اور کلکتہ آتا جاتا رہتا ہوں۔ ریاست ارنولی کے مقدمہ کی پیروی کے لیے ولایت بھی جانا چاہتا ہوں اور ارادہ ہے کہ انشاءاللہ ڈاکٹر ہنٹر اور دیگر موافق و مخالف انگریزوں سے ملاقات کر کے اس قدرتِ الٰہی کا ان سے اعتراف کراؤں گا۔

جب میں انبالہ کچہری کے اس مقام کو دیکھتا ہوں، جہاں مجھے پھانسی کا حکم سنایا گیا تھا یا جب انبالہ جیل کے پاس سے نکلتا ہوں، جہاں ڈیڑھ برس تک پسِ دیوارِ زنداں پابند زنجیر و سلاسل رہا، یا ان سڑکوں پر گزرتا ہوں، پھانسی کا حکم سنانے کے بعد جن سے ہوتے ہوئے جیل خانہ لے گئے تھے، تو قدرتِ الٰہی کو دیکھ کر میرا دل ہل جاتا ہے اور خیال کرتا ہوں

کہ جس دن مجھے پھانسی کا حکم سنایا گیا، کسے گمان تھا کہ کبھی میں ان مقامات اور سڑکوں پر بے روک ٹوک چل سکوں گا۔ ہرگز ہرگز نہیں کسی فرد بشر کو بھی یہ گمان نہ تھا۔

یہ فقط اس رب قدیر کا کام ہے کہ اس نے زمانے کے یہ سب گرم و سرد تماشے دکھا کر پھر اپنے نالائق اور مغرور غلام کو اس ملک میں دوبارہ آباد کر دیا ہے اور پہلے کی نسبت وہ چند لوگوں کی آنکھوں میں معزز اور ممتاز بنا دیا ہے۔ وذٰلك فضل اللّٰه یؤتیه من یشآء۔

**خاتمہ** اس قصہ کو محض ایک کہانی یا ایک فوجداری مقدمہ کا تجربہ ہی نہ سمجھو بلکہ یہ قصہ تو آیاتِ الٰہی میں سے ایک بڑی روشن آیت ہے۔ خداوند تعالیٰ قرآن مجید میں ایسے ہی قصوں کے متعلق فرماتے ہیں:۔

لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب۔ — ان کے قصے میں عقلمندوں کے لیے عبرت ہے۔

اور یہ میں نے زیب داستان کے لیے شہپرِ قلم نہیں کیا بلکہ ارشادِ خداوندی:۔

واما بنعمۃ ربك فحدث — اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہنا کی تعمیل ہے۔

میں نے اللہ رب العالمین جل جلالہ وعم نوالہ کے جملہ انعاماتِ ظاہری و باطنی کو نہایت اختصار کے ساتھ لکھ کر آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب آخر میں یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس محنت و مشقت اور تکالیفِ قید کو ریا سے پاک کر کے قبول فرما لے اور قارئین کرام کو اس قصہ سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔ اللھم انا نجعلك فی نحورھم ونعوذ بك من شرورھم۔